غیر ملکی سیاحوں کی

سیاحتِ کشمیر

سید سلیم گردیزی

غیر ملکی سیاحوں کی

سیاحتِ کشمیر

(سید سلیم گردیزی)

ھمالہ پبلیکیشنز 2
پوسٹ بکس نمبر 20 مظفر آباد

نام کتاب	غیر ملکی سیاحوں کی سیاحت کشمیر
پبلشر	ہمالہ پبلیکیشنز، مظفر آباد، آزاد کشمیر
اشاعت	اوّل مئی 2007ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	200 روپے (اندرون ملک)
	10 امریکی ڈالرز (بیرون ملک)

ملنے کا پتہ:

پوسٹ بکس نمبر 20 مظفر آباد، آزاد جموں وکشمیر

ای میل: s_saleemgardazi@.com

حسنِ ترتیب

کچھ مصنف کے بارہ میں

سید سلیم گردیزی کا نام ریاست جموں وکشمیر کے علمی، ادبی اور سیاسی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ یکم جون 1965 کو مردم خیز سرزمین پونچھ کے گاؤں موہری فرمان شاہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی ہائی سکول سے حاصل کی۔ گورنمنٹ ڈگری (اب پوسٹ گریجویٹ) کالج باغ سے گریجوایشن، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے ایم اے اردو اور جامعہ کراچی سے ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ زمانہ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ ہوئے اور جموں وکشمیر اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم کی حیثیت سے ریاست بھر کے طلبہ کی قیادت کی۔ گورنمنٹ کالج باغ کی سٹوڈنٹس یونین کے بالترتیب جوائنٹ سیکرٹری، جنرل سیکرٹری، نائب صدر اور صدر بھی رہے۔ ایک بھرپور اور ہنگامہ خیز سیاسی زندگی گزارنے کے باوجود انہوں نے تعلیمی میدان میں بھی کامیابیوں کے شاندار ریکارڈ قائم کئے۔ اسّی کی دہائی میں افغانستان میں روسی استعمار کے خلاف لڑی جانے والی جنگ آزادی میں ایک مجاہد کی حیثیت سے شامل رہے۔ ریاست جموں وکشمیر کی تحریک آزادی نے 1990 کے اوائل میں ایک نئی کروٹ لے کر مسلح تحریک مزاحمت کی شکل اختیار کی تو سید سلیم گردیزی اس تحریک کے اولین معماروں میں سے تھے۔ وہ 1990 میں کنٹرول لائن عبور کرتے ہوئے مقبوضہ کشمیر گئے اور تحریک آزادی کی ترتیب وتنظیم میں مشاورتی کردار ادا کیا۔ واپسی پر "میں نے کشمیر جلتے دیکھا" کے نام سے اپنے سفر کشمیر کی روداد لکھی جسے جنگ پبلشرز لاہور نے شائع کیا۔ سیاست، صحافت اور وکالت کے ریگزاروں کی آبلہ پائی کے علاوہ انہوں نے محکمہ تعلیم میں لیکچرار کی حیثیت سے تدریسی خدمات بھی سرانجام دی ہیں۔ انہوں نے مظفر آباد میں ایک پرائیویٹ کالج بھی قائم کیا۔ بعد میں آزاد جموں وکشمیر پبلک سروس کمیشن کے زیرِ اہتمام مقابلے کا امتحان پاس کر کے سیکشن آفیسر تعینات ہوئے اور آج کل محکمہ سروسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن میں اسی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

پیش لفظ

کشمیر خالقِ کائنات کے حُسنِ تخلیق کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہر دور میں حُسنِ فطرت کے پرستار دنیا کے کونے کونے سے اس خطہءِ لالہ وگُل میں آتے اور اپنے ذوقِ دید کی تسکین کا سامان کرتے رہے ہیں ۔ اس خطہ ارضی کو دستِ قدرت نے جس مہارت سے تراشا ہے اس کی نظیر دنیا کا کوئی اور خطہ پیش نہیں کرسکتا۔ جہاں دنیا کے تین عظیم ترین پہاڑی سلسلے کوہ ہمالیہ، کوہ قراقرم اور کوہ ہندوکش باہم ملتے ہیں۔ جو تین عظیم جغرافیائی خِطوں وسط ایشیاء، جنوبی ایشیاء اور مشرقِ بعید کا مقام اتصال ہے۔ جہاں سر بفلک اور برف پوش پہاڑ بھی ہیں اور حد نظر تک پھیلے ہوئے مرغزار بھی۔ جہاں گنگناتی ندیاں بھی ہیں اور خاموش اور پرسکون نیلگوں جھیلیں بھی، بل کھاتے دریا بھی ہیں اور شاداب وادیاں بھی، سبزے کی لہک بھی ہے، پھولوں کی مہک بھی اور پرندوں کی چہک بھی، آب و ہوا اور موسموں کے اعتبار سے بھی جتنا تنوع اور جتنی رنگا رنگی اس خطے میں پائی جاتی ہے شاید ہی دنیا میں اس کی نظیر مل سکے۔ سردی، گرمی، بہار، خزاں، برسات، غرض ہر طرح کے موسم اپنی پوری جوانی اور جولانی کے ساتھ اس ریاست میں پائے جاتے ہیں۔ جموں کے میدانوں کی جُھلسا دینے والی گرمی ہو یا وادی کشمیر کی خوشگوار ٹھنڈک یا پیر پنجال اور دیوسائی میدان کی برفباری، گلگت بلتستان کی شدید آب و ہوا ہو یا آزاد کشمیر کے پہاڑی خطے کا معتدل موسم، یہاں کے باشندے تمام موسموں کے خُوگر اور فطرت کی ہر ادا کے شناسا ہیں۔

جموں و کشمیر کی انہی خصوصیات کی بناء پر شاعروں نے اسے جنت ارضی قرار دیا۔ سیاحوں نے اسے دنیا کا ہیرا Jewel of the World اور فردوس گم گشتہ

(The Paradise Lost) کہا۔ مغل بادشاہ جہانگیر اس وادیٔ گل رنگ کے حُسن کا اس درجہ اسیر ہوا کہ اسے دیکھتے ہی پکار اٹھا۔

اگر فردوس بروئے زمیں است

ہمیں است وہمیں است وہمیں است

اس جنت نظیر خطے کی ایک جھلک دیکھنے ہر دور میں سیاح آتے رہے۔ ان میں سے بعض نے باقاعدہ سفرنامے لکھے جو دنیا کے مختلف ملکوں سے مختلف زبانوں میں شائع ہوئے اور دنیا بھر میں اس خوبصورت سرزمین کے تعارف کا باعث بنے۔ ان سیاحوں میں ہیون سانگ اور فاھیان جیسے بدھ مت کے مبلغین بھی تھے، سید شرف الدین بلبل شاہؒ اور سید علی ہمدانیؒ جیسے مصلحین اور داعیانِ اسلام بھی اور فادر ژاویر (xavir)، فادر ڈی سدری اور جوزف وولف جیسے مسیحی مشنری بھی............... مسیحی مشنریوں کی یلغار تو کشمیر پر اس قدر رہی کہ اکبری عہد کے فادر ژاویر سے لے کر 1947ء میں کشمیر سے رخصت ہونے والے ٹنڈل بسکو تک، درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں مسیحی مبلغین نے یہاں اپنی مشنری سرگرمیاں جاری رکھیں اور یہاں کے لوگوں کو مسیحیت کی طرف متوجہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چرچ بنائے، ہسپتال بنائے، سکول کھولے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ انہیں یہاں کے باشندوں میں کوئی پذیرائی نہ مل سکی۔ اس ریاست کے باشندوں نے سادات صوفیاء اور علماء کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اسلام کی سیدھی سادی تعلیمات پر اس شرح صدر سے ایمان لائے کہ کوئی مسیحی شعبدہ بازی انہیں اپنے ایمان اور اعتقاد سے نہ پھیر سکی۔

جن سیاحوں نے اس خطہ جنت نظیر کی سیر و سیاحت کے مشاہدات و تاثرات اپنے سفرناموں میں بیان کیے ہیں ان میں جارج فاسٹر جیسا بے برگ و ساماں فقیر اور درویش منش سیاح بھی ہے جس کی کل کائنات ایک پیالے اور ایک سگار پائپ پر مشتمل تھی

اور وکٹر ژاک مونٹ جیسا شاہانہ ٹھاٹ باٹھ کا حامل سیاح بھی، جس کے ساتھ قلیوں اور مزدوروں کی فوج اور کئی گھوڑوں اور اونٹوں پر لدا سامان سفر بھی تھا۔ اگرچہ انجام سب کا ایک ہوا کہ۔

اول و آخر فنا، باطن وظاہر فنا
نقش کُہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

لیکن ان سب فانی اور آنی و جانی سیاحوں کو ان کے سفرناموں نے امر کر دیا۔ وہ نہ صرف امر ہو گئے بلکہ وہ اپنے عہد کو بھی زندہ جاوید کر گئے۔ ان میں سے بعض تو مغلیہ عہد میں یا اس سے قبل کشمیر آئے مثلاً برنیئر، جارج فاسٹر اور ڈی سدری۔ ایسے سیاحوں نے کشمیر کے عہد شباب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے حُسن و رعنائی، تعمیر و ترقی، نشاط و شالیمار کی بہاروں، ولر اور ڈل کے نظاروں، باشندگان ریاست کی خوشحالی اور فارغ البالی، ان کے خوبصورت نقش و نگار اور علم و فضل سے ان کی والہانہ لگن کو بیان کرنے میں کسی بُخل سے کام نہیں لیا۔ لیکن بعد کے سیاحوں کو کشمیر میں وہ حُسن دلکشی نظر نہ آئی جس کی وجہ یہ ہے کہ سکھوں، افغانوں اور ڈوگروں کے دور میں کشمیر بدترین غلامی کی شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کی بہاریں لُٹ چکی تھیں اور اس کی ترقی قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ یوں ان سیاحوں کے سفرناموں کے آئینے میں اس دور کے کشمیر کی تصویر نظر آجاتی ہے۔ حکمرانوں کا ظلم واستبداد، باشندگان ریاست کی مظلومیت، غلامی کے لہراتے منحوس سائے، قحط اور غربت و افلاس کے مناظر، یہ سب کچھ ان سیاحوں کے سفرناموں کے آئینے میں جھلکتا ہے۔

میں نے خود کشمیر کا سفر کیا ہے اور اپنے مشاہدات و تاثرات اپنی کتاب "میں نے کشمیر جلتے دیکھا" میں تحریر کیے ہیں۔ میری طرح اور بہت سے لوگ بھی جن کا تعلق کشمیر، پاکستان یا بھارت سے ہے، نے کشمیر پر سفرنامے لکھے ہیں لیکن زیرنظر کتاب میں ان کے سفرناموں کا تذکرہ شامل نہیں ہے۔ میں نے صرف ان سیاحوں کا تذکرہ کیا ہے جن کا تعلق غیر منقسم برصغیر کے باہر سے ہے۔

اس طرح ریاست کے جغرافیائی، تاریخی، سیاسی اور تہذیبی پس منظر اور نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط قضیہ کشمیر پر بھی میں نے خامہ فرسائی نہیں کی۔ اس حوالے سے سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور مسلسل لکھی جا رہی ہیں۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط یہ مسئلہ اقوام متحدہ کی بوسیدہ فائلوں میں چنگاری بن کر سلگ رہا ہے۔ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے کتابوں کے اتنے انبار اگر عالمی ضمیر پر رکھی ہوئی برف کی سلوں کو پگھلانے میں کامیاب نہیں ہو سکے تو میری حقیر سی کاوش کس شمار قطار میں ہوگی۔ لہذا زیرِ نظر کتاب میں میں نے خود کو صرف سیاحت کے موضوع تک ہی محدود رکھا ہے۔

غیر ملکی سیاحوں کے سفرناموں پر تحقیق ایک دشوار اور مشکل کام تھا کیونکہ یہ سیاح مختلف ممالک اور مختلف براعظموں سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے سفرنامے ان کے اپنے اپنے ممالک میں ان کی اپنی اپنی زبانوں میں شائع ہوئے۔ ان سفرناموں کے اصل نسخے یا تراجم حاصل کرنا بھی ایک دُشوار امر تھا۔ میں نے کتاب کے اسلوب کو بھی دقیق اور تحقیقی کی بجائے سیدھا سادا اور رواں ہی رکھا ہے اور خواہ مخواہ حوالہ در حوالہ اور نقل و اقتباس کی کوفت سے قارئین کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ جو کچھ لکھا ہے یہی میرا اسلوبِ تحریر ہے۔ قبل ازیں میری کتاب ,,میں نے کشمیر جلتے دکھا،، مطبوعہ جنگ پبلشرز لاہور کو قارئین نے جو پذیرائی بخشی اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اس کے لیے بھی میں قارئین کرام کا شکر گزار ہوں۔

زیرِ نظر کتاب میں اپنے موضوع کا کس حد تک حق ادا کر پایا ہوں اس کا فیصلہ بھی قارئین پر چھوڑتا ہوں

(سید سلیم گردیزی)
مظفر آباد آزاد کشمیر
فون نمبر: 0301-5676404
ای میل: s_saleemgardezi@yahoo.com

۱

فاہیان۔ کشمیر کا پہلا مسافر

ہمالیہ کے دامن میں جموں و کشمیر کی حسین وجمیل وادیوں کی سیاحت کے لیے ہر دور میں دور و نزدیک سے بے شمار سیاح آتے اور اس خطے کے حُسن ورعنائی کے مناظر سے قلب و نگاہ کو تازگی بخشتے رہے۔ سیاحوں کی آمدرفت کے اس سلسلہ کا آغاز 500 قبل مسیح میں سکندر اعظم کے ہندوستان پر حملے سے ہوتا ہے۔ سکندر اعظم کا مقابلہ جہلم کے نزدیک راجہ پورس سے ہوا جس میں راجہ پورس کو شکست ہوئی۔ سکندر اعظم کی فوج کے ہمراہ یونان کا عظیم فلسفی اور مورخ ہیروڈوٹس بھی تھا جسے تاریخ کا باوا آدام کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی تحریروں میں کشمیر کا تذکرہ کیا ہے اور اس خطہ کو ,,کسپیریا،، کے نام سے یاد کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ سکندرِ اعظم اپنے اس حملے کے دوران اس علاقے سے گزرا ہے، جو اب ریاست جموں و کشمیر کا حصہ ہے۔ ہوا یوں کے سکندرِ اعظم کے لشکر کو دریائے جہلم عبور کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ ملی تو اس نے منگلا کے قریب سے جہاں دریا کا پاٹ کم تھا، دریائے جہلم

عبور کیا۔ یوں یہ بات تاریخی طور پر غلط نہیں کہ سکندر اعظم اور ہیروڈوٹس سرزمین کشمیر سے گزرے ہیں۔ ہیروڈوٹس کے بعد مشہور عالم سیاح مارکو پولو نے بھی اپنے سفرنامے میں کشمیر کا ذکر کیا ہے۔ اور یہاں کی آب وہوا باشندگان ریاست کے رہن سہن، تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ مارکو پولو کے سفر کشمیر کی بھی کوئی براہ راست شہادت کتب تاریخ میں موجود نہیں تاہم اپنی تحریر میں اس نے جس تفصیل سے کشمیر کا تذکرہ کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے مشہور زمانہ سفروں کے دوران اس کا گزر اس ریاست کے کسی حصے سے ضرور ہوا ہوگا۔

کشمیر کی باقاعدہ سیاحت کرنے والا سب سے پہلا غیر ملکی سیاح فاہیان ہے جس کا تعلق چین سے تھا۔ وہ بدھ مت کا ایک سرکردہ عالم اور محقق تھا۔ بدھ مت کا ابتدائی مسکن ہندوستان تھا۔ بعد میں ہندومت اور شومت نے بدھ مت کی جگہ لے لی اور بدھ مت کے پیروکار ہندوستان سے بھاگ کر برما، سری لنکا، چین، جاپان اور کوریا کے علاقوں میں پھیل گئے اور یوں بدھ مت نے مشرق بعید کو اپنا نیا مسکن بنالیا۔ اپنی جنم بھومی سے کٹ کر بدھ مت کو بے شمار داخلی تضادات کا سامنا کرنا پڑا۔ مختلف فرقے وجود میں آگئے اور ہر فرقہ اپنے انداز سے اپنے دھرم کی تعبیر وتشریح کرنے لگا اور نوبت انتشار اور خلفشار تک پہنچ گئی۔

ان حالات میں فاہیان نے بدھ مت کے اصل ماخذوں کا سراغ لگانے اور اپنے مذہب کے اصل خدوخال اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ بدھ مت کے آثار، سٹوپاؤں، مقدس مذہبی کتب، مجموعہ ہائے قوانین اور مورتیوں کی تلاش کے لیے اس نے 399ء میں سرزمین ھند کا سفر کیا اور اپنے سفر کے دوران وادی کشمیر اور اس کے نواحی پہاڑی علاقوں میں بھی گھوما پھرا۔

مقامات اور علاقوں کے نام چونکہ آج سے سترہ سو سال قبل بعینہ وہی نہیں تھے جو

آج ہیں بلکہ بادشاہتوں کے عروج وزوال، اور انقلابات زمانہ کے باعث دنیا کا جغرافیہ ہی نہیں تاریخ بھی ہمیشہ تبدیلیوں کی زد میں رہی ہے۔ اس عرصے میں بڑی بڑی مملکتیں دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئیں اور ان کا سورج نصف النہار پر چمکنے کے بعد ایسا غروب ہوا کہ آج ہمیں ان میں سے چند ایک کے نام ہی معلوم ہیں۔ اسی طرح مقامات اور علاقوں کے نام بھی بدلتے رہے۔ اس لیے فاہیان کے سفرنامے میں بیان کردہ مقامات کا خطے کے مقامات کے موجودہ ناموں کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے محققین کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور اکثر نے ٹامک ٹوئیاں مارکر تک بندی کے ذریعے بیان کردہ مقامات کی نشاندھی کی کوشش کی ہے۔ کشمیر کا نام بھی اس کے سفرنامے میں موجود نہیں جس کے باعث بعض غیر ملکی محققین و شارحین نے اس کے سفر کشمیر کا ذکر ہی گول کر دیا ہے۔ محققین نے اس معاملہ میں بھی بے پر کی اڑائی ہے کہ اس نے اوچنگ کے شمال میں واقع ایک ریاست گندھار کا نام لیا ہے تو محققین اور شارحین کی بڑی تعداد نے اسے قندہار مراد لے لیا حالانکہ اس سے مراد ٹیکسلا اور اس سے ملحقہ علاقے ہیں جو گندھارا کے نام سے معروف تھے اور یہ علاقہ چندر گپت موریہ کا پایہ تخت بھی رہا۔ بعد میں اشوک کے بدھ مت قبول کرلینے سے یہ سارا علاقہ بدھ مت کا اہم مرکز بن گیا۔ بدھ مت اور اشوک تہذیب کے آثار اب بھی اس علاقے میں بکھرے پڑے ہیں لہذا فاہیان کو اگر کوئی دلچسپی ہوسکتی تھی تو وہ گندھارا سے تھی نہ کہ قندہار سے۔ اس غلطی کے باعث انہوں نے اوچنگ کی ریاست کا اصل حدود اربعہ متعین کرنے میں بھی ٹھوکر کھائی اور اوچنگ کو اٹھا کر پشاور سے قندہار تک پھیلا دیا۔

اپنے سفرنامے میں فاہیان نے اوچنگ کی ریاست کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ کشمیر پر صادق آتے ہیں اور بعض محققین جن میں جنرل کننگھم اور میکس مولر بھی شامل ہیں، کے خیال میں اوچنگ سے مراد کشمیر اور اس کے نواحات ہی ہیں۔ مثلاً فاہیان لکھتا ہے:

''اوچنگ کی ریاست ہندوستان کا انتہائی شمالی حصہ تشکیل دیتی ہے۔ اوچنگ دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر بلند پہاڑوں میں گھری ہوئی ریاست ہے جو سرسبز و شاداب، جنگلوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ جس کی مٹی بڑی زرخیز ہے اور بارشیں بڑی کثرت سے ہوتی ہیں۔ جہاں ہر طرح کا اناج اور غلہ پیدا ہوتا ہے۔ پھلوں کی بہتات اور پھولوں کی فراوانی ہے''۔ اس نے اس ریاست کو دریاؤں، پہاڑوں، وادیوں اور جھیلوں کا ملک قرار دیا ہے اور اس ریاست کو ہمالیائی سلسلہ کوہ میں بتایا ہے۔

فاہیان کے ان واضح بیانات کے باوجود حیرت ہے کہ محققین نے اسے کشمیر تسلیم کرنے میں کیوں بُخل سے کام لیا ہے؟ فاہیان اگر بدھ مت کا مبلغ نہ بھی ہوتا تو بھی اپنے سفر ہند کے دوران فطرت کے حُسنِ تخلیق کا شاہکار ریاست کشمیر کی سیاحت اس کے سفر ہند کا لازمی تقاضا تھا۔ بدھ مت کے پیروکار ''نروان'' حاصل کرنے کشمیر کے جنگلوں، پہاڑوں، غاروں اور جھیلوں کا رخ کرتے تھے اور جہاں وہ ''نروان'' حاصل کرنے بیٹھتے تھے۔ وہ علاقے بدھ مت کے پیروکاروں کے لیے مقدس مقامات کی حیثیت اختیار کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بدھ بھکشوؤں نے آبادیوں سے دور ایسے ہی مقامات کو اپنی عبادت گاہوں کے طور پر منتخب کیا۔ لازمی بات ہے کہ وہ اپنے سفر کے دوران وادی نیلم کے خوبصورت اور تاریخی مقام شاردہ بھی گیا ہوگا اور عین ممکن ہے کہ جس جگہ کے بارہ میں اس نے لکھا ہے کہ:

''یہاں ناگوں کے بادشاہ کا مندر ہے اور اس جگہ بدھ نے دریا کے کنارے کپڑے سکھائے تھے''۔

وہ یہی مقام ہو، جہاں بدھ مت کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ قدیم زمانے میں یہاں بدھ مت کی ایک یونیورسٹی قائم تھی جہاں ہندوستان، برما، سری لنکا کے علاوہ افغانستان چین اور مشرق بعید سے بدھ مت کے پیروکار آتے اور مذہبی تعلیم حاصل کرتے

تھے۔اسی طرح سری نگر سے چند میل کے فاصلے پر پانڈرِیٹھن نامی قصبہ کسی دور میں کشمیر کا دارالحکومت رہا ہے اور اس دور کے آثار اب بھی پانڈرریٹھن میں دیکھے جاسکتے ہیں۔وادی لولاب کا نواحی علاقہ قلعہ روس بھی قابلِ ذکر ہے۔جہاں اس دور کی تباہ شدہ تہذیب کی علامات، پتھر کی لوحین اور مورتیاں ایک بڑے غار کے دہانے کے قرب وجوار میں بکھری پڑی ہیں۔میں نے اپنے سفر کشمیر کے دوران ان آثار کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے۔ مجھے اس بات پر بہت دکھ ہوا ہے کہ کشمیر کی حکومت نے اس اہم تاریخی ورثے کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کیا۔مقامی چرواہے اور بکروال پتھر پر کندہ ان لوحوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں اور کسی دیوار کی تعمیر میں استعمال کر دیتے ہیں۔اپنے اس تاریخی سفر کے دوران فاہیان ٹیکسلا اور سوات کے علاقے میں بھی گیا۔وہ سوات کو سوتو ہو کے نام سے یاد کرتا ہے۔اس نے دریائے جمنا کے کنارے آباد متھرا اور قنوج کی سیاحت بھی کی۔وہ گوتم بدھ کی جائے پیدائش کپل وستو بھی گیا۔پھر وہ پاٹلی پتر (موجودہ پٹنہ) بھی گیا۔بدھ مت کے تمام مراکز اس نے ویران حالت میں دیکھے اس لیے کہ ان علاقوں پر اب ہندومت کی فرمانروائی تھی اور ہندومت کے پیروکاروں نے بدھ مت کے تمام نقوش ڈھونڈ ڈھونڈ کر محو کر دیئے تھے۔وہ مشرقی بہار کے دارالحکومت چمپا بھی گیا۔اس نے اس سفر کے دوران میں کشمیر اور ہندوستان بھر سے بدھ مت کے آثار اور کتبوں کی نقول تیار کر کے اپنے ساتھ رکھیں۔بدھ بھکشوؤں اور مذہبی راہنماؤں سے بدھ مت کے عقائد اور تعلیمات پر بحث وتمحیص کی اور اس کی اصل حالت کے احیاء کے لیے نقوش کار طے کیے۔اس نے مقدس مذہبی کتب، آثار اور مخطوطے بھی جمع کیے۔

دو سال ہندوستان میں گزارنے کے بعد وہ ایک تجارتی جہاز کے ذریعے لنکا روانہ ہو گیا۔لنکا میں بھی اس نے دو سال قیام کیا اور اپنے بھاری بھر کم سامان کے ساتھ ایک

تجارتی جہاز پر چین کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں جہاز طوفان کی زد میں آ گیا۔ وزن گھٹانے کے لیے تمام مسافروں نے اپنا مال واسباب سمندر میں پھینک دیا۔ فاہیان نے بھی حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے اپنا گھڑا اور کٹورا سمندر میں پھینک دیا۔ دیگر مسافر اس کے بھاری بھرکم سامان کی طرف گھور گھور کر دیکھتے رہے۔ کچھ نے سامان سمیت اسے بھی اٹھا کر سمندر میں پھینکنے کا ارادہ کیا لیکن اس نے اپنی مذہبی حیثیت کا بتا کر انہیں اس ارادے کی تکمیل سے باز رکھا۔ تیرہ دن جہاز طوفان کی زد میں رہا۔ بالاخر جہاز ایک جزیرہ پر پہنچا جہاں اس کی مرمت کی گئی اور دوبارہ سمندری سفر پر روانہ ہو گیا۔ 90 دن کے سفر کے بعد جہاز جاوا کے جزیرے میں پہنچا۔ پانچ ماہ تک جاوا میں قیام کیا اور پھر چل سو چل اس نے اپنے وطن جانے کی ٹھانی۔ جہاز سمندر کی شوریدہ لہروں پر ہچکولے کھاتا ہوا خراماں خراماں آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک بار پھر طوفان کی زد میں آ گیا۔ اب کی بار جہاز میں کچھ برہمن بھی سوار تھے۔ انہوں نے فاہیان کو ہی طوفان کا سبب گردانا کہ اس کی شامت اعمال سے جہاز طوفان میں گھر گیا ہے، اور اسے اٹھا کر مال واسباب سمیت سمندر میں پھینکنے کی کوششیں کی لیکن اس کے محافظ نے بے جگری سے اس کا دفاع کیا اور اس کی جان بچائی۔ جاوا سے 82 دن کے سفر کے بعد فاہیان واپس اپنے وطن چین جا پہنچا۔

۲

ہیون سانگ ۔ ایک اور چینی سیاح

فاہیان کے سفر کشمیر کے دوسو سال بعد ایک اور چینی سیاح وارد کشمیر ہوا۔ اس سیاح کا نام ہیون سانگ تھا۔ اس کے نام کے تلفظ پر اختلاف ہے، بعض نے اس کو ہیون تسانگ اور بعض نے ہیوتسانگ بھی لکھا ہے تاہم اکثریت نے اسے ہیون سانگ ہی لکھا ہے۔ ہیون سانگ 600ء کے لگ بھگ چین کے علاقے چن لیو (موجودہ ''کے فنگ'') میں پیدا ہوا۔ اس نے 629ء سے 645ء تک برصغیر ہندو پاکستان اور کشمیر کے علاقوں کا سفر کیا۔ اس کے سفر کے مقاصد بھی وہی تھے جو اس کے پیشرو فاہیان کے تھے۔ یہ بھی ان تمام علاقوں میں گھوما پھرا جہاں اس سے قبل فاہیان جادہ پیمائی کر چکا تھا۔ اس نے 74 کتابوں کے تراجم کیے اور اہم مخطوطوں اور لوحوں کی نقول تیار کیں۔

کشمیر پہنچنے سے پہلے اس نے سوات اور ہزارہ کے علاقوں میں کافی عرصہ گزارا۔ ہزارہ کو اس نے وو۔لا۔شا۔(ارشا) کا نام دیا ہے اور لکھا ہے کہ ندی نالوں، پہاڑوں اور

وادیوں پر مشتمل یہ علاقہ ریاست کشمیر کے ماتحت ہے۔ پتہ نہیں کس وجہ سے اس نے ہزارہ کے باسیوں کے بارہ میں کسی اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا اور انہیں سخت مزاج، درشت، دھوکہ باز اور بے ذوق گردانا ہے۔

ہزارہ سے کشمیر کا فاصلہ اس نے ایک ہزار لی بیان کیا ہے (اندازاً پانچ لی ایک میل کے برابر ہوتے تھے)۔ کشمیر کو اس نے کیا۔شی۔می۔لو۔ کا نام دیا ہے جو کشمیر کا چینی تلفظ ہے۔ وہ جب کشمیر پہنچا تو یہاں ایک طاقتور حکمران درلب وردھن یا اس کے جانشین کی حکومت تھی۔ کشمیر کے حکمران نے اس کی خوب خاطر مدارت اور آؤ بھگت کی اور اس کی رہائش، خوراک اور سواری کا خاطر خواہ انتظام کیا۔ اس کی تحریروں کی نقول تیار کرنے کے لیے اس نے کاتبوں اور کلرکوں کی بڑی تعداد بھی اسے فراہم کی۔

کشمیر کے بارہ میں اس نے لکھا ہے کہ یہ خوبصورت وادی چاروں طرف سے بلند و بالا برفانی پہاڑوں نے گھیر رکھی ہے اور یہی پہاڑ اس کی آزادی اور سلامتی کے محافظ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کوئی بیرونی حملہ آور قوم اس پر فتح حاصل نہیں کر سکی ہے۔ بہت بڑا دریا، دریائے سندھ ریاست کی مغربی سرحد تشکیل دیتا ہے۔ یہاں کی مٹی زرخیز اور اناج کے لیے نہایت موزوں ہے۔ یہاں پھلوں، پھولوں کی بہتات ہے۔ یہاں ناگوں (چشموں) کی کثرت ہے۔ گھوڑے اور دوسرے جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ خوشبودار ہلدی (کٹھ) اور جڑی بوٹیوں کی فراوانی ہے۔ موسم ٹھنڈا اور سخت ہے۔ لوگ اندر چمڑے کے اور باہر سفید پٹو کے کپڑے پہنتے ہیں۔ ہزارہ کے لوگوں کی طرح کشمیر کے لوگوں کے بارہ میں بھی اس کی رائے اچھی نہیں ہے وہ انہیں زیادہ پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔

وادی کشمیر کی سیاحت کے بعد وہ پونچھ کے لیے عازم سفر ہوا۔ دریائے جہلم سے لے کر پیر پنجال کی چوٹیوں تک پھیلی ہوئی یہ پہاڑی ریاست ہر دور میں ایک خودمختار یا نیم خودمختار

ریاست رہی ہے۔ ہیون سانگ کے سفر پونچھ کے وقت پر کشمیر کے ماتحت نیم خود مختار ریاست تھی۔ پونچھ کو اس نے پو۔نو۔تسو لکھا ہے۔ جو کہ پونچھ کا چینی تلفظ ہے۔ ہیون سانگ کے بقول یہ ریاست پہاڑوں، جنگلوں، وادیوں، اور ندی نالوں پر مشتمل ہے۔کاشت کاری کے قابل زمین کم ہے۔پھل اور پھول بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہاں کی آب وہوا گرم مرطوب ہے۔لوگ عام سوتی کپڑے پہنتے ہیں۔ یہاں کے باشندے بہادر، مزاج کے کھرے اور قول کے سچے ہیں۔ بدھ مت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہاں پانچ آشرم ہیں، اکثر ویران پڑے ہیں۔ایک سٹوپا اپنے معجزات کے لیے مشہور ہے۔

پونچھ سے چارسولی (80 میل تقریباً) کے فاصلے پر مشرق کی طرف راجوری کی ریاست ہے۔اس کی آب ہوا اور لوگوں کے انداز و اطوار پونچھ سے ملتے جلتے ہیں۔

۳

اوکونگ بدھ آثار کی تلاش میں

ساہیان اور ہیون تسانگ کے بعد ایک اور چینی سیاح 759ء میں کشمیر وارد ہوا اور مسلسل چار سال تک کشمیر کے طول وعرض کی سیر وسیاحت میں گزارے۔اس نے بھی اپنے پیشرو سیاحوں کی طرح اپنے مشاہدات وتاثرات کو کتابی شکل میں مدوّن کیا۔اس کا سفرنامہ زمانے کی دستبرد کا شکار ہو کر ناپید ہوگیا۔تھا بعد میں میسرز لیوی اینڈ کینوس نے کہیں سے دریافت کر کے شائع کیا۔

اوکونگ کا مشن بھی اپنے پیشرو بدھ سیاحوں کے مشن سے مختلف نہ تھا۔وہ بھی بدھ مت کے آثار کی دریافت ،مقدس مقامات کی زیارت اور مقدس کتابوں اور کتبوں کے مطالعے کے لیے وارد کشمیر ہوا تھا۔ وہ طلوع صبح سے رات گئے تک مطالعہ ومشاہدہ اور سیر وتفریح میں مشغول رہتا اور رات گئے اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹتا تھا۔کشمیر میں رہ کر اس

نے سنسکرت زبان بھی سیکھی اور سنسکرت علوم کا مطالعہ بھی کیا۔ کشمیر میں اس نے تقریباً 300 بدھ عبادت گاہوں کا تذکرہ کیا ہے جبکہ فاہیان اور ہیون سانگ کے سفر کشمیر کے دوران یہ تعداد صرف 100 تھی لگتا ہے کہ ہیون تسانگ اور اوکونگ کے سیاحت کشمیر کے درمیانی عرصہ میں کشمیر میں ایک بار پھر بدھ مت کو قابلِ قدر پذیرائی ملی تھی اور اس عرصہ میں بدھ مت پھر روبہ عروج تھا۔ ممکن ہے اس درمیانی عرصہ میں چین اور تبت کی طرف سے بدھ مت کے دیگر علماء اور مبلغین بھی کشمیر آتے جاتے رہے ہوں اور کشمیران کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا ہو۔ لیکن انہوں نے چونکہ سفرنامے نہیں لکھے لہذا ان کے ناموں اور تعداد کے بارہ میں کچھ معلوم نہیں ۔ زمانی بُعد کے باوجود فاہیان، ہیون تسانگ، اور اوکونگ کے مشن کی وحدت اور مقاصد سفر کی یکسانیت اس دور کے بدھ مت کی کشمیر پر خصوصی توجہ کی غماز ہے۔

اوکونگ نے بھی اپنے پیشرو سیاحوں کی طرح کشمیر کے حالات تفصیل سے اپنے سفرنامے میں لکھے ہیں۔ کشمیر کے جغرافیائی حالات، موسمی کیفیات، اثمار و اشجار، فصلوں، قدرتی راستوں، پہاڑی دروں، بلند پہاڑوں، وادیوں اور گھاٹیوں کے بارہ میں اس نے تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں لیکن اس کا مشاہدہ ہیون تسانگ کی طرح عمیق نہیں۔ وہ کسی چیز کی گہرائی میں جا کر اس کا تجزیہ نہیں کرتا اور نہ کسی تجسس کا مظاہرہ کرتا ہے بلکہ راہ چلتے مسافر کی طرح ہر چیز پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتا ہے اور سادہ سے انداز میں اس کا سرسری ذکر کر کے آگے نکل جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وادی کے چاروں طرف پہاڑ ایک قدرتی فصیل کی طرح بلند ہیں جو بیرونی حملہ آوروں سے اس کی حفاظت کرتے ہیں اس نے بتایا ہے کہ تین قدرتی راستے کشمیر کو باہر کی دنیا سے ملاتے ہیں ایک راستہ مشرق میں توفن (تبت) کی طرف جاتا ہے یہ وہی درہ ہے جو درہ زوجیلا کے نام سے مشہور ہے اور وادی کشمیر کو عہد قدیم سے مشرقی ممالک خصوصاً وسط ایشیاء سے ملاتا ہے۔ دوسرا ن راستہ شمال

میں بولیو(بلتستان) کی طرف جاتا ہے۔تیسرا راستہ گندھارا کی طرف جاتا ہے۔یہی راستہ 1947 تک جہلم ویلی روڈ کے طور پر کشمیر کو باہر کی دنیا سے ملاتا رہا ہے جسے 1947ء میں ریاست کے بڑے حصے پر بھارتی تسلط کے نتیجہ میں بند کر دیا گیا اور یوں کشمیر کا باہر کی دنیا سے ملانے کا قدرتی راستہ مسدود ہو گیا۔اب نصب صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد اس راستے کو محدود پیمانے پر آمدورفت کے لیے استعمال میں لایا جانے لگا ہے۔اوکونگ کو کوئی چوتھا راستہ بھی معلوم تھا جس کے بارہ میں وہ لکھتا ہے کہ یہ راستہ سال کا زیادہ تر حصہ بند رہتا ہے۔غالباً اس کا اشارہ بہرام گلہ پونچھ راجوری سے ہوتے ہوئے براستہ بھمبر گجرات پہنچنے والے اس راستے کی طرف ہے جسے بعد میں مُغل روٹ کا نام دیا گیا اور جس راستے سے اکبر اعظم، جہانگیر اور اورنگ زیب کشمیر آتے جاتے رہے۔

اوکونگ نے کشمیر کی زرخیزی، باشندگان کشمیر کی خوبصورتی، ذہانت اور خوشحالی کا تذکرہ اپنے پیشرو سیاحوں کی طرح بڑی فیاضی سے کیا ہے۔اس نے بڑی وضاحت کے ساتھ کشمیر کی جھیلوں، ندی نالوں، دریاؤں، فصلوں، باغات اور جڑی بوٹیوں کا ذکر کیا ہے لیکن اس سب کچھ کے باوجود اس کی اصل توجہ سٹوپوں اور معابد کی تلاش اور بدھ مت کی کتابوں کی دریافت اور مطالعے پر رہی۔اوکونگ چین کی طرف سے وادیِ کشمیر آنے والا آخری معلوم سیاح ہے۔اس کے بعد لگتا ہے چین اور کشمیر کے تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ شاید اس کی وجہ سے یہ ہو کہ کشمیر کے ملحقہ علاقے چین کے کنٹرول سے نکل کر تبت کی عملداری میں چلے گئے ہوں جس کی وجہ سے چینیوں کی آمدورفت مسد ہو گئی۔شاید یہی وجہ ہے کہ اوکونگ کے بعد کوئی چینی سیاح بدھ مت کے آثار کی دیکھ بھال کرنے نہیں آیا۔

۴

البیرونی اور کشمیر

چینی سیاح اوکونگ کی سیاحت کشمیر سے کوئی اڑھائی سو سال بعد جس پہلے مسلم سیاح نے سرزمین کشمیر کی سیاحت کی وہ مشہور جغرافیہ دان، سیاح اور محقق ابو ریحان البیرونی تھا۔ اس نے ہندوستان میں طویل عرصہ گزارا اور اپنی مشہور زمانہ ''کتاب الہند'' لکھی جس میں ہندوستان کی سرزمین، یہاں کے موسموں، فصلوں، باشندگان ہند کے رسم ورواج، مذہب، علوم، فلسفہ تاریخ، نفسیات غرض ہندوستانی زندگی کے ہر پہلو پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔ اس نے جہلم میں کافی عرصہ گزارا اور یہاں اس نے ہندوؤں سے سنسکرت زبان سیکھی۔ وہ یہاں کی معاشرت اور تہذیب وتمدن کے ہر پہلو پر ماہرانہ عبور رکھتا تھا۔

سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے تھے جن میں کشمیر پر کیا جانے والا حملہ بھی شامل ہے۔ اس نے 1021ء میں کشمیر پر اسی راستہ سے حملہ کیا تھا جس راستے

پر چل کر بعد میں مغل حکمران کشمیر آتے جاتے رہے اور جسے بعد میں مغل روٹ کا نام دیا گیا۔ غالباً البیرونی بھی محمود غزنوی کے ہمراہ تھا۔ توشہ میدان کے راستے محمود غزنوی کا لشکر وادی کشمیر پر حملہ آور ہوا لیکن فتح مند نہ ہوسکا۔ ہر چند کہ البیرونی محمود غزنوی کے ہمراہ تھا لیکن دونوں کے مقاصد جدا جدا تھے۔ محمود غزنوی کا حملہ تو بوجوہ ناکام ہو گیا لیکن البیرونی اپنے مقاصد سفر میں کامیاب رہا اور اس نے کشمیر سے متعلق بیش قیمت معلومات حاصل کر لیں۔ جن سے اس نے باہر کی دنیا کو آگاہ کیا۔

کتاب الہند کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ البیرونی نے جہلم ویلی روڈ کے ذریعے بھی کشمیر کی سیاحت کی ہے کیونکہ اس نے ہزارہ، جو اس زمانے میں ارشا کے نام سے الگ سلطنت تھی اور اس کا دارالحکومت ایبٹ آباد کے قریب ببرہان میں تھا، کے حالات بھی تفصیل سے لکھے ہیں اور وہاں سے وہ جہلم ویلی کی طرف اپنے سفر کا آغاز کرتا نظر آتا ہے۔ اس نے موجودہ مظفر آباد کا فاصلہ ببرہان سے ۸ فرسخ بیان کیا ہے جو کہ 39 میل بنتا ہے۔

البیرونی نے اپنے سفرنامے میں مظفر آباد کا تذکرہ بھی کیا ہے اگرچہ یہ قصبہ ابھی تک مظفر آباد کے نام سے موسوم نہیں ہوا تھا۔ البیرونی لکھتا ہے کہ دریائے گشناری (کنہار) اور دریائے مہوی (کشن گنگا موجودہ دریائے نیلم) ایک پل کے پاس دریائے جہلم میں آ کر گرتے ہیں۔ البیرونی کے اس بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت دریائے کہنار راڑہ کے مقام پر نہیں بلکہ لوہار گلی کے قریب سے گزر کر چھتر دومیل کے مقام پر دریائے جہلم میں گرتا تھا۔ عین ممکن ہے دریا نے اپنا موجودہ راستہ بعد میں اختیار کیا ہو اور اس وقت کی صورت حال وہی رہی ہو جو البیرونی کے بیان سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ ماہرینِ ارضیات ہی کر سکتے ہیں۔ پنڈت کلہن نے مشہور زمانہ راج ترنگنی کا آغاز 1070 میں کیا اور 1150ء میں یہ کتاب تکمیل کو پہنچی۔ اس میں بھی پنڈت کلہن نے

البیرونی کے حوالے سے مظفر آباد کا تذکرہ اسی طرح کیا ہے۔

البیرونی نے کشمیر کے تمدنی اور سیاسی حالات بھی تفصیل سے لکھے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

> "کشمیری اپنے ملک میں غیر ملکیوں کو برداشت نہیں کرتے۔ اگلے وقتوں میں اِکا دُکا یہودی آجاتے تھے لیکن اب وہ کسی ایسے ہندو کو بھی کشمیر میں رہنے کی اجازت نہیں دیتے جسے وہ ذاتی طور پر جانتے نہ ہوں۔ وہ اپنی سرحدوں کی حفاظت کا پورا اہتمام کرتے ہیں"۔

سری نگر کے بارہ میں اس نے لکھا ہے:

> "سری نگر دریا کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ کشتی کے پلوں کے ذریعے دریا پار کیا جاتا ہے۔ شہر کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک آمدورفت کشتیوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ سری نگر کا شہر چار فرسخ قطعہ زمین پر پھیلا ہوا ہے"۔

قبل ازیں ساتویں صدی میں ہیون تسانگ کشمیر آیا تھا تو اس وقت بھی یہ شہر پرور پور کے نام سے موجود تھا اور دریا کے دائیں کنارے پر آباد تھا۔ تب سے سری نگر ترقی کرتے ہوئے اب دریا کے دونوں کناروں پر آباد ہو چکا تھا۔ البیرونی کے دور کا کشمیر بڑا خوشحال تھا۔ سری نگر شہر ایک جدید، خوبصورت اور بھرا پُرا شہر بن چکا تھا۔ راج ترنگنی کے مصنف نے تو لکھا ہے کہ اس کے مکان کثیر منزلہ ہیں جن کی بلندی بادلوں تک پہنچتی ہے۔ آمدورفت ندیوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ البیرونی نے اس دور کے سری نگر کی تعریف میں کسی بُخل سے کام نہیں لیا۔

۵

اولیائے کرام کی سیاحت کشمیر

چینی سیاحوں اور البیرونی کے بعد عرصہ تک کشمیر میں کسی غیر ملکی سیاح کی آمد کا سراغ نہیں ملتا۔ اس عرصے میں دنیا کے مختلف خطے مختلف تبدیلیوں کے عمل سے گزرے۔ بہت سی بادشاہتیں صفحہ ہستی پر نمودار ہوئیں اور ان کا سورج نصف النہار پر پہنچ کر بالاخر غروب ہوتا رہا۔ مختلف انقلابات نے دنیا کی تاریخ بدلی تو جغرافیہ بھی از خود بدلتا گیا تاہم جنتِ ارضی کی سیاحت کرنے والے کسی قابلِ ذکر سیاح کا سراغ نہیں ملتا۔ ہاں! مختلف ادوار میں اللہ کے نیک بندے خلق خدا کو دین حق کی دعوت دینے مختلف مما لک سے کشمیر کے دورے پر آتے جاتے اور بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ ایسے ہی ایک بزرگ ترکستان کے رہنے والے حضرت عبدالرحمٰن عرف بلبل شاہؒ تھے جنہوں نے 751ھ میں کشمیر کا تبلیغی سفر کیا۔ پہلی مرتبہ وہ راجہ سہادیو کے دور میں کشمیر آئے تھے۔ دوسری مرتبہ یہاں کا حکمران ایک تبتی شہزادہ رینچن شاہ تھا جو بدھ مت کا پیروکار تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بلبل شاہؒ نے اس کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔ وہ اسلام کی حقانیت، صداقت اور سادگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس نے اسلام کے دامن رحمت میں پناہ ڈھونڈ لی۔ رینچن شاہ کے قبول اسلام کے ساتھ ہی کشمیر میں اشاعت اسلام کا دروازہ کھل گیا

اور ایک مسلمان حکومت وجود میں آ گئی۔

سید عبدالرحمٰنؒ عرف بلبل شاہ کے بعد حضرت سید تاج الدینؒ 760ھ میں اور حضرت سید حسن سمنانیؒ 773ھ میں ایران سے کشمیر تشریف لائے یہ دونوں بزرگ بھی خالصتاً تبلیغی مشن پر آئے تھے اور ان کی کوششوں سے یہاں اسلامی تہذیب وتمدن کا احیاء ہوا اور اسلامی تعلیمات کو فروغ ملا۔

حضرت امیر کبیرؒ کی آمد

کشمیر کی تہذیب وتمدن، اخلاق وعادات، رسم ورواج غرضیکہ یہاں کی اجتماعی زندگی کے ہر شعبے پر سب سے زیادہ اثرات مرتب کرنے والی ہستی حضرت سید علی ہمدانیؒ کی ہے۔ وہ متذکرہ بالا دونوں بزرگوں، حضرت سید تاج الدینؒ اور حضرت سید حسن سمنانیؒ کے چچازاد بھائی تھے۔ ان دونوں بزرگوں کو حضرت سید علی ہمدانیؒ نے ہی کشمیر میں دعوت دین کے امکانات کا جائزہ لینے بھیجا تھا تاکہ ایک مربوط منصوبہ بندی اور حکمت عملی کے ساتھ اس خطے کو دعوت حق اور اقامت دین کی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جاسکے۔

حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ سات سو سادات علمائے کرام اور مبلغین کی ایک بڑی جماعت کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے تاکہ یہاں کے طول وعرض میں یہ مبلغین اور مصلحین عوام الناس کو اسلام کی بنیادی تعلیمات اور ایمان کے تقاضوں سے آگاہ کریں اور ان کی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ اس وقت کشمیر کا حکمران سلطان قطب الدین تھا جو کسی مہم پر کشمیر سے باہر گیا ہوا تھا اور اس کا بھائی سلطان شہاب الدین اس کے نائب کی حیثیت سے امور مملکت چلا رہا تھا۔

چار ماہ قیام کے بعد حضرت شاہ ہمدانؒ حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظّمہ تشریف لے گئے جہاں سے مختلف ممالک میں دعوت وتبلیغ کی ذمے داریاں ادا کرتے

رہے۔ 1379ء میں ایک بار پھر کشمیر تشریف لائے۔ اس مرتبہ اڑھائی سال تک کشمیر میں قیام کیا۔ پھر تیسری مرتبہ 1387ء میں کشمیر واپس تشریف لائے لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد واپس روانہ ہو گئے۔ پکھلی ضلع ہزارہ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے مریدوں نے آپ کا جسد خاکی تاجکستان کے علاقے ختلان پہنچا دیا جہاں دریائے جیحوں کے کنارے شہر کولاب میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

حضرت سید علی ہمدانیؒ محض ایک مبلغ ہی نہ تھے بلکہ ایک مُصلح، دانشور اور بالغ نظر سیاسی راہنما بھی تھے۔ آپ اپنے ہمراہ ایران سے مختلف ہنر مندوں اور کاریگروں کو کشمیر لائے اور یہاں ایرانی قالین بافی، شال بافی، گبہ سازی، نمدہ سازی، ووڈ کارونگ اور دوسری صنعتوں کو متعارف کرایا جن پر آج تک کشمیر کی معیشت کا انحصار ہے۔ آپ نے سلطان شہاب الدین کے ذریعے متعدد زرعی اصلاحات متعارف کرائیں، اسلامی شرعی نظام نافذ کرایا اور کشمیر کو حقیقی معنوں میں انقلاب سے روشناس کرایا۔

٦

مسیحی مبلغین کشمیر میں

اس سارے عرصے میں جبکہ چین، ترکستان اور ایران سے بدھ اور مسلمان مبلغین اور سیاح کشمیر آتے اور جاتے رہے، اہل یورپ کشمیر کے فطری حُسن اور دلکشی سے بے خبر رہے۔ اگرچہ مشہور اطالوی سیاح مارکو پولو تیرھویں صدی عیسوی میں مشرقی ممالک کے سفر کے دوران کشمیر کی سرحد چین تک آ پہنچا تھا اور اپنے سفرنامے میں وہ کشمیر کا تذکرہ بھی کر چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اہل مغرب نے کشمیر کی سیاحت کے حوالے سے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا اور کشمیر اہلِ مغرب کے لیے ایک سربستہ راز ہی رہا۔

کولمبس کو امریکہ دریافت کیے ہوئے ایک سو سال ہو چکے تھے کہ پرتگیزی مسیحی مشنریوں نے مغرب کے لیے کشمیر کو دریافت کیا۔ یہ اکبر اعظم کا دور تھا۔ شہنشاہ اکبر مذہب پر اچھی طرح کاربند نہ ہونے کے باوجود مختلف مذاہب کے بارے میں معلومات میں بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ اسلام، ہندومت، بدھ مت، عیسائیت اور دیگر مذاہب کے بارے میں اس کے دربار میں اکثر مناظرے بپا رہتے تھے اور وہ مختلف مذاہب کے علماء کی گفتگو اور استدلال کو بڑی دلچسپی سے سنتا تھا۔ مذہب عیسائیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اکبر نے مسیحی چرچ میں اپنا ایک نمائندہ بھیجا اور فرمائش کی کہ اس کے دربار میں دو ایسے

عالم فاضل پادری بھیجے جائیں جو عیسائیت پر مکمل عبور رکھتے ہوں اور اپنے ہمراہ مسیحیت کے بارے میں کتب بھی لائیں۔شہنشاہ اکبر کی اس فرمائش پر عیسائی مشنریوں نے خوشی کے شادیانے بجائے۔انہوں نے سوچا اگر دنیا کا یہ طاقتور ترین حکمران عیسائیت قبول کر لے تو سارے مشرق پر عیسائیت کا پرچم لہرانے لگے گا۔انہوں نے فوری طور پر چوٹی کے دو عیسائی مبلغ اکبر کے دربار میں بھیجے۔لیکن اسی اثناء میں عیسائیت کے بارے میں اکبر کی دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔یکے بعد دیگر دو تین مشن اکبر کے دربار میں پہنچے، لیکن اکبر کو اپنے دین کا پیرو بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔1595ء میں فادر جیروم ژاویر (Jerom xavir) اور برادر بیناسٹ ڈی گوز Benast De-Goose نامی دو مسیحی مبلغ لاہور میں اکبر کے دربار میں پہنچے۔وہ دو سال دربار اکبری سے وابستہ رہے لیکن انہیں اپنے مشن میں کوئی کامیابی نہ ہو سکی۔دریں اثناء عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا جس کے باعث اکبر کو ذہنی سکون کی خاطر کشمیر جیسے صحت افزا مقام کا سفر کرنا پڑا اور پرتگیزی مشنریوں کے لیے بھی کشمیر کے دروازے کھل گئے یوں اہلِ مغرب حُسنِ مشرق سے متعارف ہوئے۔

اکبر اعظم کا سفر کشمیر

ہوا یوں کہ شاہی قلعہ لاہور میں ایک شاہی ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں تمام عمائدین سلطنت، امراء، سفراء، روساء ، اہلِ دربار اور شاہی خاندان کے تمام لوگ مدعو تھے۔اسی اثناء میں آسمانی بجلی گری اور نہ صرف محل کے ایک بڑے حصے کو نقصان پہنچا بلکہ سونے کا بنا ہوا ایک نہایت قیمتی شاہی تاج بھی پگھل گیا جس کے بارے میں ان پادریوں کا کہنا ہے کہ دنیا بھر کے شاہی تاج مل کر بھی اس کی قیمت کے برابر نہیں تھے۔سونا چاندی سب کچھ پگھل گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نالیوں میں پگھلا ہوا سونا پانی کی طرح بہتا رہا۔آگ اکبر کے محل میں داخل ہوئی اور اس کے تمام شاہی خزانے کو جلا کر راکھ کر گئی۔اس

حادثے کے اثرات سے اپنے ذہن کو چھٹکارا دلانے کے لیے اکبر نے کشمیر کی سیر کا پروگرام بنایا۔ دونوں عیسائی پادریوں کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔

ژاویر کے مشاہدات

فادر ژاویر نے اپنے مشاہدات سفر نامے کی شکل میں لکھے۔ یہ سفر نامہ پہلی بار Antwerp سے 1605ء میں شائع ہوا۔ مہر و ماہ کو تسخیر کرنے والے اہلِ مغرب پہلی بار ژاویر کے سفر نامے کے ذریعے جنتِ ارضی سے متعارف ہوئے۔ بقول ژاویر:۔

"The kingdom of Caximir (Kashmir) is one of the pleasantest and the most beautiful countries to be found in whole of the India, we may even say, in the East."

(مملکت کشمیر نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے مشرق میں سب سے زیادہ خوبصورت اور خوش گوار ملک ہے)

تمام دوسرے سیاحوں کی طرح فادر ژاویر بھی کشمیر کے فطری حُسن، دریاؤں کے بہاؤ، آبشاروں کی گنگناہٹ، چشموں کی روانی، سبزہ زاروں، باغوں اور کھیتوں کی شادابی اور حُسنِ فطرت کی ہر رنگ میں جلوہ آرائی سے بے حد متاثر ہوا۔ اس سب کچھ کے باوجود اس نے کشمیر کے باشندوں کی حالت زار پر شدید دکھ کا اظہار کیا ہے۔ جنت ارضی کے باسیوں کی غربت، مظلومیت اور بے چارگی کی حقیقی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"کشمیر کے لوگ فاقہ کشی کا شکار ہیں۔ ملک قحط کے پنجے میں ہے۔
غلے کی کمیابی کا حکمرانوں کے محلات پر تو کوئی اثر نہیں البتہ سرینگر شہر
میں مائیں جو اپنے بچوں کے لیے خوراک کا بندوبست کرنے کے
قابل نہیں ہیں، اس امید پر اپنے بچوں کو فروخت کر رہی ہیں کہ کوئی

شخص انہیں خرید کر ان کی پرورش کر سکے۔"

سفرنامے کے مطابق ان پادریوں نے خود کئی بچوں کو خرید کر انہیں موت کے منہ میں جانے سے بچایا۔ مسیحی مشنری مہینوں کشمیر میں رہے اور فطرت کی فیاضی اور باشندگان جنتِ ارضی کی سیاہ بختی کا بچشم خود مشاہدہ اور ماتم کرتے رہے۔

دریں اثناء وہ موقع پاتے ہی شہنشاہ اکبر کو مسیحیت کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بھلا جو شخص سیدھے سادے، عام فہم اور عقل و منطق کے معیارات پر پورا اترنے والے دینِ اسلام کے بارے میں زیادہ پر جوش نہ رہا ہو، تثلیث جیسے غیر منطقی اور گنجلک فلسفے پر کیسے اعتقاد کر لیتا؟ نتیجہ یہ نکلا کہ پادریوں کو ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اکبر کا دلچسپ رویہ

اس سارے عرصے میں اکبر نے پادریوں کے ساتھ دلچسپ رویہ رکھا۔ جونہی پادری نصرانیت کے بارے میں بادشاہ کی عدم دلچسپی سے مایوس ہو کر واپسی کا پروگرام بنانے لگتے، اکبر ان کے مذہب کے بارے میں مصنوعی قسم کے تجسس اور ہمدردی کا کوئی ہلکا سا مظاہرہ کر دیتا اور پادریوں کی پھر سے امید بندھ جاتی۔ لیکن اکبر پھر سے لاتعلق سا ہو جاتا۔ یوں ہی وقت گزرتا اور پادری امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ اکبر کی "صاف چھپتے بھی نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں" والی کیفیت پادریوں کے لیے ایک معمہ بنی رہی۔

بالاخر مایوس مشنری 13 نومبر 1605ء کو واپس لاہور پہنچے۔ سفر کی مشکلات اور تھکاوٹ نے ان کی مایوسیوں کو اور بڑھا دیا تھا۔ اسی سال شہنشاہ اکبر کا انتقال ہو گیا۔ فادر ژاویرا اکبر سے مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا۔ اب اسے اس کے جانشین پر قسمت آزمائی کرنا تھی۔ جہانگیر اس کا جانشین بنا۔ سیاسی مصلحت بھی اسی میں تھی کہ ہندوستان کے نئے حکمران کے ساتھ بھی پرتگیزیوں کے تعلقات کا سلسلہ برقرار رہے۔ لہذا فادر ژاویرے نے واپسی کا

ارادہ ترک کر دیا اور بدستور مغل دربار سے وابستہ رہا۔ 1617ء میں وہ اپنے وطن واپس چلا گیا اور اسی سال اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا ساتھی برادر بیناسٹ ڈی گور پہلے ہی ہندوستان چھوڑ کر چین کی طرف چلا گیا تھا۔ تین سال کے تکلیف دہ سفر کے بعد ڈی گوز چین پہنچا لیکن جلد ہی بیمار ہو کر مر گیا۔ کشمیر کے حُسن و دلکشی اور کشمیریوں کی تیرہ بختی اور مفلوک الحالی کی ایک جھلک فادر ژاویر نے اہل مغرب کو پہلی بار دکھائی لیکن مغرب نے اس کے باوجود کشمیر کے بارے میں کسی قسم کی دلچسپی یا تجسس کا اظہار نہیں کیا اور نصف صدی تک کسی دوسرے یورپی سیاح یا پادری نے کشمیر کا رخ نہ کیا۔

۷

مورخ، محقق، دانشور، سیاح

فرانکوئس برینئر

کشمیر کا دورہ کرنے والا بعد کا مغربی سیاح فرانس سے تعلق رکھنے والا فرانکوئس برنیئر ایک کثیر الجہت شخص تھا۔ وہ ایک مقبول مصنف ہونے کے علاوہ معروف معالج بھی تھا۔ مزاحیہ ، ہنس مکھ اور خوش باش ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک فلسفی، دانشور، اور سائنس دان بھی تھا۔ برنیئر پہلا شخص ہے جس نے کشمیر کو مشرق کی جنت (Paradise of the East) قرار دیا۔ اس نے کشمیر کے خوابیدہ حُسن کی تصویر اس مہارت اور چابک دستی سے کھینچی کہ اہلِ مغرب انگشت بدنداں رہ گئے۔ اس کے بعد تو جنت ارضی کی سیاحت کے لیے مغربی سیاحوں کا تانتا بندھ گیا۔

برنیئر 1660ء میں انجو (فرانس) کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس نے University of Montpeller سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا اور پیرس میں مستقل رہائش اختیار کی۔ مہم جوئی اور سیر و سیاحت کا شوق اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس نے مشرق وسطیٰ کی سیاحت کا پروگرام بنایا۔ مشرق وسطیٰ کے مختلف ممالک میں گھوم پھر کر اس نے اپنے ذوق سیاحت کی تسکین کی۔ 36 سال کی عمر میں وہ اپنی زندگی کے اس غیر معمولی سفر

پر روانہ ہو گیا جس نے بالاخر اسے شہرت دوام عطام کی۔ وہ دراصل بحیرہ احمر کو عبور کر کے حبشہ جانا چاہتا تھا لیکن حبشہ سے آنے والے سیاحوں کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ حبشہ مسافروں کے لیے انتہائی غیر محفوظ ہو چکا ہے۔ اور وہاں لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ یوں یمن سے ہی اس نے اپنے سفر کا رخ تبدیل کیا اور 1659ء میں وہ ہندوستان کے شہر سورت پہنچ گیا۔

جنگِ برادران

ہندوستان اس وقت ایک بحرانی کیفیت سے دوچار تھا۔ دہلی کا تاجدار شاہجہان تخت سے معزول ہو چکا تھا اور اس کے چاروں بیٹے تخت کے لیے باہم دگر برسر پیکار تھے۔ خانہ جنگی نے ملک کا امن و امان تباہ کر رکھا تھا اور ہر طرف بے یقینی کے سائے لہرا رہے تھے۔ برنیئر کی ہندوستان آمد کے موقع پر داراشکوہ اپنے بھائی اورنگزیب سے ابھی تازہ شکست کھا چکا تھا لیکن اقتدار پر ابھی تک عالم گیر کی گرفت مضبوط نہیں ہوئی تھی۔ برنیئر دہلی پہنچا اور اس ڈرامے میں خود بھی شامل ہو گیا۔ سورت سے وہ دہلی آیا اور سیدھا داراشکوہ کے پاس چلا گیا جو اپنے بھائی سے شکست کھانے کے بعد اپنی شکست خوردہ فوج کو لیے احمد آباد کی طرف جا رہا تھا تا کہ وہاں اپنے لیے پناہ اور کمک حاصل کر سکے۔ اورنگزیب کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد اس کا لشکر قابلِ رحم حالت میں سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔ جگہ جگہ مقامی لوگوں کے ہاتھوں لٹنے کی وجہ سے لشکر کا مورال خطرناک حد تک گر چکا تھا۔ داراشکوہ کی ایک بیوی بری طرح زخمی تھی۔ جب داراشکوہ کو برنیئر کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر ہے تو اس نے اصرار کر کے برنیئر کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ تین دن تک برنیئر داراشکوہ کے لشکر کے ہمراہ محوسفر رہا اور اس کی زخمی بیوی کا علاج معالجہ کرتا رہا، اس سفر کا حال برنیئر یوں بیان کرتا ہے:

"گرمی ناقابل برداشت تھی اور گرد وغبار سے دم گھٹتا تھا۔ میرا چھکڑا
کھینچنے والے تین بیلوں میں سے ایک مر گیا تھا، دوسرا نیم مردہ حالت
میں تھا اور تیسرا اس بیگار کو جاری رکھنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔"

اس صورتِ حال میں برنیئر کے لیے دارا شکوہ کے ساتھ مزید سفر جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ احمد آباد میں دارا شکوہ کو پناہ نہ مل سکی۔ اہلِ شہر نے اس کے لیے شہر پناہ کے دروازے کھولنے سے انکار کر دیا۔ برنیئر کے بقول دارا شکوہ پر نیم مردنی کی حالت طاری تھی۔

احمد آباد سے خستہ تن دارا شکوہ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سندھ کا رخ کیا تا کہ وہاں سے موقع ملتے ہی وہ ایران کی طرف نکل جائے۔ برنیئر نے اپنا چھکڑا احمد آباد کی فصیل کے باہر کھڑا کیا اور قافلے سے الگ ہو گیا۔ ادھر بدقسمت دارا شکوہ کو ایک مقامی سردار نے گرفتار کر کے اورنگزیب کے حوالے کر دیا، جس نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بعد میں برنیئر اورنگ زیب کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔

برنیئر دارا شکوہ کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ "وہ ایک مہذب، شائستہ اور ہمدرد انسان تھا جس میں بے شمار اعلیٰ انسانی خوبیاں اور کمالات جمع تھے"۔ اورنگزیب عالمگیر کے تخت نشینی کے چھ سال بعد برنیئر دارا شکوہ کی پسندیدہ وادی کشمیر کی سیاحت کو نکلا۔ اس نے وہاں دارا شکوہ کے باغات، عمارات، پری محل اور پتھر مسجد وغیرہ دیکھے۔ دارا شکوہ کی خوبیوں اور کمالات کا وہ پہلے ہی معترف تھا۔ کشمیر میں دارا شکوہ کی تعمیر کردہ رصدگاہ جسے پری محل کہتے ہیں اور اس کی بنوائی ہوئی خوبصورت پتھر مسجد دیکھ کر اسے خوش ذوق شہزادے کی یاد بے طرح ستانے لگی جسے وہ احمد آباد کی شہر پناہ کے باہر چھوڑ کر آیا تھا۔ ہر چند وہ طویل عرصہ عالمگیر کے دربار سے وابستہ رہا لیکن وہ عالمگیر کی شخصیت سے کبھی متاثر نہ ہو سکا۔

برنیئر نے اپنی کتاب کا آغاز اسی جنگِ برادران سے کیا ہے اور ابتدائی چوتھائی

حصہ اسی جنگ کے بیان پر مشتمل ہے۔ بقیہ کتاب ہندوستان کے معاشی حالات، مملکت کے نظم ونسق اور ہندوؤں کے رسم و رواج کے بیان پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اس دور کے ہندوستان کا واضح عکس دکھانے والا آئینہ ہے۔ برنیئر کی رائے اور تجزیئے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی وسعتِ نظر، مشاہدہ اور ذوق تجسس کی داد دیئے بغیر چارہ نہیں۔

اصل سفر نامہ فرانسیسی زبان میں ہے جو 1672ء میں ایمسٹرڈم سے شائع ہوا۔ اس کے بعد یورپ کی تقریباً سبھی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اردو میں سب سے پہلے اس کا ترجمہ کرنل ہنری مور نے 1875ء میں کیا۔ لیکن اسکی زبان بہت گنجلک غیر شُستہ تھی۔ بعد میں سید محمد حسین، میر منشی ریاست پٹیالہ نے کرنل مور کے ترجمے کو سامنے رکھ کر اسے شُستہ، رواں اور بامحاورہ اردو کے سانچے میں ڈھالا۔ اس پر مزید نظرثانی ان کے بھائی وزیراعظم ریاست پٹیالہ سید محمد حسن نے کی۔ یہ ترجمہ امرتسر اور مراد آباد سے بالترتیب 1886ء اور 1888ء میں شائع ہوا۔ سید محمد حُسن نے اسے اپنے خرچ پر چھپوایا اور اس کی آمدن علی گڑھ کالج کے نام وقف کر دی۔ بعد میں 1906ء میں مدرستہ العلوم علی گڑھ کے ڈیوٹی بک ڈپو نے اسے شائع کروایا۔ یہ اردو ترجمہ "شاہجہان کے ایام اسیری اور اورنگزیب کا عہد" کے نام سے کتابی صورت میں اب بھی موجود ہے۔

احمد آباد سے برنیئر دلی پہنچا۔ اگرچہ داراشکوہ کے بارے میں ہمدردی اور محبت کے جذبات اس کے دل میں تازیست موجزن رہے تاہم اس نے بعد میں اورنگزیب عالمگیر کے دربارے میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہ اورنگزیب کے ایک قریب معتمد اور اس دور کے ایک عالم فاضل شخص دانشمند خان کے سٹاف میں شامل ہوگیا۔ اس کا کام جدید مغربی علوم وافکار کا ترجمہ فارسی زبان میں کرنا اور جدید مغربی تحقیق کے نتائج سے اورنگزیب اور دانشمند خان کو باخبر رکھنا تھا۔ وہ ایک ڈاکٹر تھا اس لحاظ سے اسے شاہی طبیب کا مقام بھی حاصل تھا۔

شاہی طبیب کی حیثیت سے حرم شاہی میں اس کا آنا جانا تھا۔اس لحاظ سے حرم شاہی کے تمام سربستہ رازوں سے وہ باخبر تھا لیکن اس نے شاہی خاندان کی نجی زندگی کو اپنی ذات تک محدود رکھا اور کسی قسم کی رائے زنی سے اجتناب کیا ہے۔

اورنگزیب سوئے کشمیر

اورنگزیب کے عہد کی سب سے موثر خاتون اس کی بہن روشن آرا بیگم تھیں جو اپنے فہم وبصیرت، دانشمندی اور اورنگزیب سے وفاداری میں بے مثال تھی۔اس کی تحریک پر اورنگزیب نے موسم گرما کشمیر میں گزارنے کا پروگرام بنایا اور یوں شاہی دربار کشمیر کے لیے روانہ ہوا۔اورنگزیب کا سفر کشمیر صرف اورنگزیب، اس کے دربار کے امراء اور ان کے حرم کی چند بیگمات تک محدود نہ تھا بلکہ ایک بہت بڑے شاہی لشکر نے دلی سے سری نگر کی طرف کوچ کیا۔اس میں شاہی افواج اور دلی کے تاجروں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل ہوگئی۔اس طرح ہر طبقے کے افراد،ان کی بیگمات ، خدام اور سازوسامان ، گویا ایک پورا شہر دسمبر 1664ء میں دلی سے کشمیر کے سفر پر نکلا۔

برنیئر کے بیان کے مطابق یہ لشکر جب میلوں تک دھول اڑاتا سوئے کشمیر روانہ ہوا تو اس کے ساتھ ایک لاکھ گھڑسوار تھے جبکہ ہزاروں گھوڑے،اونٹ،اور ہاتھی اس کے علاوہ اس لشکر میں شامل تھے جو بچوں،عورتوں، اور سازوسامان سے لدے ہوئے تھے۔ ہزاروں گائیں،بیل، بھیڑ بکریاں اور دوسرے جانوروں کا ریوڑ بھی ان کے ساتھ تھا جو ہر پڑاؤ پر ان کی خوراک کے کام آتا تھا۔اورنگزیب کشمیر کی سیاحت جیسے بے ضرر اور رومانوی قسم کے مشن پر اس شاہانہ شان وشوکت اور لاؤلشکر کے ساتھ نکلا کہ لوگوں کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ وہ کشمیر کی سیاحت پر روانہ ہو رہا ہے بلکہ عام خیال کیا جانے لگا کہ وہ قندھار کا محاصرہ کرنے جارہا ہے۔اور کشمیر کا نام صرف دشمن کو دھوکہ دینے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔

روشن آراء بیگم اس قافلے کی روح رواں اور مرکز نگاہ تھی۔ وہ ریشمی لباس میں ملبوس تھی اور سنہری اور سبز رنگ کے ریشمی پردوں سے آراستہ ایک پالکی پر سوار تھی جسے ہاتھی اٹھائے ہوئے تھا۔ ہاتھیوں کو بھی خوبصورت کپڑوں اور زیورات سے مزین کیا گیا تھا۔ تیس ہاتھی صرف روشن آراء بیگم کا ذاتی سامان اٹھائے ہوئے تھے۔ لگتا ہے کہ اورنگزیب عالمگیر اپنے باپ کو بصارت سے محروم کر کے نظر بند کرنے اور اپنے بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد سب کے حصے کی محبت اپنی اسی بہن پر نچھاور کر رہا تھا۔

اتنے بڑے لاؤلشکر کے ساتھ جب اورنگزیب دلی سے روانہ ہوا تو راستے میں جگہ جگہ وہ قافلے کو روک کر شکار کے شوق سے بھی جی بہلاتا رہا جسے عام طور پر وہ "کاربیکاراں" کہتا تھا۔ اس طرح سفر سست روی سے طے ہوتا رہا اور قافلے کو لاہور تک پہنچنے میں دو ماہ لگ گئے حالانکہ لاہور دلی سے (اس وقت) پندرہ دن کی مسافت پر تھا۔ دوران سفر برنیئر کا رَختِ سفر دو عمدہ گھوڑوں اور ایک اعلیٰ نسل کے اونٹ پر لدا ہوا تھا۔ یہ سامان ایک خیمے، ایک قالین، ایک سفری بستر، کچھ کھانے پینے کی اشیاء اور کھانے پینے کے برتنوں پر مشتمل تھا۔ برنیئر اس سفر کو اپنے لیے مکمل طور پر آرام دہ اور پرآسائش رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے ملازموں میں ایک باورچی ایک شتربان اور ایک ذاتی خادم شامل تھے۔

برنیئر چونکہ دانشمند خان کی ملازمت میں تھا، اس لیے دانشمند خان نے بھی دوران سفر اس کی ضرورتوں کا بھرپور خیال رکھا۔ اس کے غیر ملکی ہونے کے باعث مغلیہ دربار کے اس سردار نے اسلامی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے وہی خوراک بہم پہنچائی جو اپنے آبائی ملک فرانس میں اسے میسر تھی۔ چنانچہ برنیئر اپنے سفرنامے میں اس بات پر اپنے میزبانوں کا شکر گزار ہے کہ دوران سفر اس کے قیام وطعام کی ضروریات کا بھرپور خیال رکھا گیا ورنہ بقول اس کے دلی کی پکی ہوئی غیر معیاری روٹی جس میں گرد وغبار اور ریت کی

ملاوٹ ہوتی ہے اس کی صحت کے لیے نہایت خطرناک ہوسکتی تھی۔اس طرح ہمسفروں کے برعکس اسے صاف ستھرا اور تازہ پانی ہر جگہ فراہم کیا جاتا رہا۔

مغلیہ دربار کا نقشہ

مغل دربار کا ایک ماہر منتظم اس عظیم الشان گشتی شہر کا انتظام وانصرام بحُسن وخوبی چلا رہا تھا۔قافلے کا منتظم عمدہ لباس میں ملبوس قافلے کے آگے آگے چلتا تھا اور سارا قافلہ اس کے نقشِ قدم پر حرکت کرتا تھا۔جہاں رات کو قیام کرنا ہوتا منتظم ساٹھ ہاتھیوں، دوسو اونٹوں اور سوآدمیوں پر مشتمل ہراول دستے کو پہلے ہی آگے بھیج کر بادشاہ کے شایان شان قیام کے لیے جملہ انتظامات کر لیتا تھا۔جونہی بادشاہ وہاں پہنچتا اس کی ضرورت اور آسائش کی ہر چیز وہاں پہلے سے قرینے اور سلیقے سے تیار ملتی۔برنیئر کے مطابق اس دیوہیکل قافلے کے قیام کے لیے جگہ کا تعین اور کیمپ کا نقشہ ماہر مغل انجینئروں کا تیار کردہ ہوتا تھا جو عموماً ایک ہی طرز کا ہوتا تھا۔شہنشاہ کا خیمہ درمیان میں ہوتا اور اس کے اردگرد ہر طبقے اور گروہ کے لوگوں کے لیے الگ الگ خیموں کے حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سلسلے ہوتے تھے وسط میں بادشاہ کے خیموں کے ساتھ ملحق شہزادوں اور شاہی خاندان کی خواتین کے خیمے ہوتے تھے اس کے بعد فوج کے خیموں کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔شاہی افواج کے ہر طبقے کے خیمے دوسرے طبقے کے خیموں سے الگ اور مختلف حیثیت کے ہوتے تھے۔تمام خیموں کا رخ بادشاہ کے خیمے کی طرف ہوتا تھا۔بادشاہ،شہزادوں اور شاہی خواتین کے خیمے خصوصی طور پر رنگ برنگے قیمتی ریشمی کپڑوں سے بنے ہوتے تھے اور مختلف نقش ونگار،سونے چاندی اور ہیرے جواہرات سے سجائے جاتے تھے۔فرش پر موٹے قالین بچھے ہوتے تھے۔ان پر عمدہ، رنگین اور قیمتی گاؤ تکیے رکھے ہوتے تھے جن سے ''ظل سبحانی'' اور ان کے عزیز واقارب ٹیک لگا کر نیم دراز ہوتے تھے۔حتیٰ کہ خیموں کی چوب پر بھی خوبصورت نقش ونگار بنے ہوتے

تھے۔البتہ دور سے دیکھنے میں سب خیمے یکساں نظر آتے تھے۔مدارج اور معیار کا فرق اندر سے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا۔

کیمپ چھ یا سات مربع میل رقبہ پر محیط ہوتا تھا۔گردوغبار اور شام کے وقت ہزاروں خیموں سے اٹھنے والے دھوئیں سے ماحول اس قدر آلودہ ہوجاتا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔باجود ایک طے شدہ اور معروف نقشے پر کیمپ لگائے جانے کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جانا دشوار ہوجاتا تھا۔اگر کوئی شخص اس کیمپ کی حدود میں کھوجاتا تو اس کا واپس ملنا محال تھا۔ کیمپ کے درمیان میں شاہی خیمے کے ساتھ ایک بلند پول نصب ہوتا تھا جو ہر طرف سے نظر آتا تھا۔رات کو اس پر چراغ روشن کردیا جاتا تھا تاکہ خیمے سے اپنا راستہ بھولنے والا شخص دور سے ہی اس مینارہ نور کو دیکھ کر اس تک راہ پاسکے۔یہاں سے اسے متعلقہ خیمے پہنچانے کا انتظام ہوتا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے،شہنشاہ اورنگزیب کے اس عظیم الشان لاؤلشکر کو دلی سے لاہور پہنچنے میں دو ماہ لگ گئے۔اگلے دو ماہ تک وہ دربار سجائے لاہور میں ہی پیر پنجال کے پہاڑی دروں پر برف پگھلنے کا انتظار کرتے رہے۔یہ اپریل کا مہینہ تھا۔اور ہندوستان میں گرمی عروج پر تھی جب وہ لاہور سے کشمیر کے لیے روانہ ہوئے۔یہاں سے جوں جوں یہ شاہی قافلہ اپنی منزل کی جانب آگے بڑھتا جاتا ہے برنیئر شاید سفر کی تھکاوٹ کے اثرات کے تحت مایوس اور پژمردہ ہوتا چلا جاتا ہے۔لاہور سے چار دن کے مسافت پر ایک کیمپ میں قیام کے دوران وہ لکھتا ہے:

''میں بلا مبالغہ اس حقیقت کا اظہار کررہا ہوں کہ بڑھتی ہوئی گرمی نے مجھے اس حد تک مایوس کردیا ہے کہ صبح جاگتے وقت مجھے یقین نہیں ہوتا کہ شام تک زندہ بھی رہ پاؤں گا۔''

لاہور سے روانگی کے چھ دن بعد یہ قافلہ دریائے چناب کے کنارے پہنچا جہاں حسب معمول قافلے کے لیے رنگ ونور کا ایک شہر رات بھر کے لیے بسایا گیا تھا۔ برنیئر روز وشب کی یکسانیت اور شاہی قافلے کی سست رفتاری سے بے حد اکتا چکا تھا۔ وہ کہتا ہے:

''طلوع ہونے والا ہر نیا دن زیادہ تکلیف دہ پیش رفت کا حامل ہے۔''

یہاں سے شاہی قافلے نے کشتیوں کے پُل کے ذریعے دریائے چناب عبور کر کے سفر جاری رکھا۔ طویل اور تھکا دینے والے اس سفر کی اگلی منزل بھمبر تھی جہاں سے ریاست جموں وکشمیر کے پہاڑی علاقے شروع ہو جاتے ہیں۔ پنجاب کی گرمی نے برنیئر کا برا حال کر دیا تھا۔ اس کے باقی ہم سفر تو گرمی کی اس شدت کے عادی تھے لیکن وہ خود فرانس کی یخ بستہ ہواؤں کا پروردہ تھا۔ چنانچہ اس کے خطوط اور سفر نامے میں جا بجا گرمی کی شدت کے ناقابل برداشت ہونے کا تذکرہ ملتا ہے۔ جوں جوں قافلہ کشمیر کے پہاڑوں کی طرف بڑھتا ہے، گرمی کی شدت میں کمی آنے کے باعث برنیئر کی طبیعت پر بھی خوشگوار اثرات مرتب ہونے لگتے ہیں۔ گرمی کی اس شدت میں کمی آنے پر اس کا نظامِ انہضام بھی بحال ہونا شروع ہوتا ہے۔ یوں بھمبر پہنچ کر اس نے کسی قدر سکھ کا سانس لیا۔ بقول برنیئر ''موسم نسبتاً سرد ہو گیا ہے۔ میرا ہاضمہ درست ہو گیا ہے اور میری کھوئی ہوئی طاقت بحال ہو گئی ہے۔''

خوشی اور آرام وسکون کے یہ لمحات بڑے گریز پا نکلے، کیونکہ کشمیر کے تنگ راستوں اور دشوار گزار پہاڑی دروں سے ہزاروں گھوڑوں، اونٹوں، ہاتھیوں اور ہزار ہا انسانوں کا یہ ٹڈی دل آسانی سے سفر جاری نہ رکھ سکتا تھا۔ پھر ریاست میں وارد ہونے والے اتنے بڑے انسانی وحیوانی سیلاب کے لیے ضروریات زندگی کی بروقت بہم رسانی اور ان کے قیام وطعام کا بندوبست بجائے خود ایک دشوار امر تھا۔

بھمبر پہنچ کر شاہی قافلے کو دو گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ بادشاہ کی ہمرکابی کے

لیے نسبتاً ایک چھوٹے گروپ کا انتخاب کیا گیا۔ جبکہ ایک بڑے حصے کو بادشاہ کی کشمیر سے واپسی تک بھمبر ہی میں یا واپس لاہور جا کر انتظار کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ ''چھوٹا گروپ'' کتنا چھوٹا تھا؟ اس کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ اس کا رخت سفر اٹھا کر پہاڑی راستوں پر چلنے کے لیے تیس ہزار قلیوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ تنہا اورنگزیب کا سامان سفر اٹھانے کے لیے چھ ہزار قلی رکھے گئے تھے۔ برنیئر کے ہمراہ صرف تین قلی تھے۔

ایک الم ناک حادثہ

یہ قافلہ بھمبر سے چھ دن میں سری نگر پہنچا۔ پنجاب کی گرمی کی نسبت خنک آب وہوا تازہ میٹھے پانی اور گرد وغبار سے پاک ماحول نے ان کی طبیعتوں پر اچھا اثر ڈالا لیکن راستوں کی تنگی، دشوار گزار پہاڑی دروں اور خم کھاتی پگڈنڈیوں میں اتنے بڑے قافلے کا سفر دشوار تر تھا۔ راستے میں جگہ جگہ قدرتی پانی کی آبشاریں، بل کھاتی ندیاں، حسین ودلکش جنگلات سے ڈھکے پہاڑ، ہری بھری چراگاہیں اور سرسبز وشاداب وادیاں قافلے والوں کا دل موہ لینے کو کافی تھیں۔ یہ قافلہ پیر پنجال کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پہاڑی دروں کو عبور کر کے کشمیر کی وادی کی طرف رواں دواں تھا کہ ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے بقولِ برنیئر، شاہی قافلے کا سارا مزا کرکرا کر دیا۔ برنیئر کے مطابق شہنشاہ پیر پنجال کے ایک پہاڑی درے (غالباً بہرام گلہ) کو عبور کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے بل کھاتے پہاڑی راستے پر روشن آراء بیگم اور شاہی حرم کی دوسری خواتین اور ان کا ساز وسامان اٹھائے ہوئے ہاتھیوں کی ایک طویل قطار رواں دواں تھی۔ اچانک ان ہاتھیوں میں سے ایک ہاتھی چلتے چلتے رک گیا اور اس نے الٹے قدموں پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے سے پیچھے والے ہاتھی سے ٹکرایا اس طرح اس سے پیچھے والا ہاتھی اس سے پیچھے والے سے، یوں تمام ہاتھی ایک دوسرے سے ٹکراتے چلے گئے۔ راستہ تنگ تھا کہ ہاتھیوں جیسی بھاری بھرکم مخلوق خود کو

سنبھال نہ سکی اور ایک ہاتھی کی اس معصوم سی شرارت کے نتیجے میں پندرہ ہاتھی پہاڑ کی عمودی گھائی سے نیچے گر پڑے۔ روشن آراء بیگم کے قافلے کی تین خواتین ہاتھیوں کے ساتھ ہی گر کر ہلاک ہوگئیں۔ شاہی قافلے کے پاس اتنے دیوہیکل ہاتھیوں کو کھائی سے اٹھانے اور واپس لاکر ان کا علاج معالجہ کرنے کا نہ تو وقت تھا اور نہ ہی یہ کٹھن کام کشمیر کے ان دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں سرانجام دیا جاسکتا تھا۔

اس واقعہ کے دو دن بعد برنیئر یہاں سے گزرا۔ اس نے دیکھا کہ کچھ ہاتھی ابھی تک زندہ تھے اور اپنی سونڈھیں بے چارگی کے عالم میں ہلا رہے تھے۔ برنیئر کے روزنامچے کا پہلا ایڈیشن جو 1762ء میں ایمسٹرڈم سے شائع ہوا تھا، میں کشمیر کا ایک نقشہ بھی شامل ہے جس میں پیر پنچال کے اس پہاڑی درے میں ہاتھیوں کے اس حادثے کے مقام کی نشاندہی کی گئی ہے۔

دلی اور پنجاب کی جھلسا دینے والی گرمی میں کئی مہینوں کے مسلسل سفر، گرد و غبار، معدے کی خرابی اور پھر وادی کشمیر کے بیرونی پہاڑی سلسلے کے دشوار گزار اور آڑے ترچھے عمودی راستوں پر طویل سفر کے باعث برنیئر کی تھکاوٹ، اکتاہٹ اور چڑچڑاپن سفرنامے کی سطر سطر سے جھلکتا ہے لیکن جونہی وہ درہ بہرام گلہ عبور کر کے کشمیر کی وادی میں قدم رکھتا ہے اس کی طبیعت کھل اٹھتی ہے۔ سفر کی مشکلات اور تکالیف اسے یاد نہیں رہتیں اور ایسا لگتا ہے کہ سیاح برنیئر کی جگہ شاعر برنیئر نے لے لی ہے جو کشمیر کے حسین مناظر کی تعریف نہایت خوبصورت اور بلیغ پیرائے میں کرتا ہے۔ چاروں طرف سے برف پوش پہاڑوں میں گھری ہوئی اس سرسبز و شاداب اور حسین و جمیل وادی پر نگاہ اولین ڈالتے ہی وہ عالم کیف میں کہتا ہے:

''ساری مملکت نہایت زرخیز شاداب باغات سے سجی نظر آتی ہے۔''

کشمیر کے پھولوں، پھلوں، شادابی و ہریالی اور زرخیزی کا ذکر کرنے کے بعد وہ کہتا ہے'' (اس دنیا میں) کشمیر ایک ایسا خطہ ہے جس کے بارے میں یہ بات حقیقتاً کہی

جاسکتی ہے کہ وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔'' کشمیریوں کی ذہانت اور علم وفن سے ان کی محبت کو وہ یوں خراج تحسین پیش کرتا ہے:

"The Kashmiris are considered much more intelligent and genius than Indian"

(کشمیریوں کو ذہانت سے بہرہ وافر ملا ہے، وہ ہندوستانیوں کے مقابلے میں زیادہ ذہین وفطین ہیں) برنیئر کشمیری فن تعمیر اور دوسرے مقامی فنون کی بھی تعریف میں یوں رطب اللسان ہے:

''مکانات اکثر لکڑی کے بنے ہوئے ہیں جو عموماً دو یا تین منزلہ ہوتے ہیں۔ تمام مکانات بڑی خوبصورتی اور مہارت سے بنائے گئے ہیں۔ اکثر مکانوں کے صحن کشادہ ہیں۔ مکانوں سے ملحقہ باغات میں خوبصورت پھول اور پھلدار درخت ہیں۔ سری نگر کے اکثر گھروں تک جھیل ڈل سے نہریں نکالی گئی ہیں اور کشتیوں کے ذریعے ان گھروں کے مکین جھیل تک براہ رست رسائی رکھتے ہیں۔ یہ باغات بڑا خوبصورت منظر پیش کرتے ہیں۔ خصوصاً موسم بہار اور موسم گرما میں جب مختلف رنگارنگ تقریبات اس خوبصورت سطح آب پر منعقد ہوتی ہیں تو رنگ ونور کا ایک سیلاب ہوتا ہے۔ جو دریائے جہلم اور جھیل ڈل کے پانیوں میں منعکس ہو رہا ہوتا ہے۔''

برنیئر مزید لکھتا ہے:

''ہری پربت کے دامن میں خوبصورت مکانات کا ایک سلسلہ ہے جنہیں اکبر کے دور میں تعمیر کیا گیا۔ ان مکانات میں شاہی مہمان قیام کرتے ہیں۔ خصوصاً جب شاہی دربار کشمیر میں سجتا ہے تو یہ مکانات شہزادوں سے آباد ہوجاتے ہیں۔ شاہی خاندن کے لوگ یہیں سے نسیم باغ،

شالامار باغ، نشاط باغ، چار چنار اور ڈل جھیل کی سیر کو نکلتے ہیں۔ اور مغلیہ باغات میں گشت کرنے کے بعد رات گئے واپس لوٹ آتے ہیں۔ جھیل ڈل کے چاروں طرف خوبصورت مکانات ہیں اور درمیان میں پیالہ نما جھیل ایک عجیب کیف آور منظر پیش کرتی ہے"۔

مغلیہ باغات کی منظر کشی کرتے ہوئے برنیئر مزید لکھتا ہے۔

"سب سے خوبصورت اور قابلِ ذکر خود مغل باغات ہیں، جنھیں بڑی خوبصورتی اور مہارت سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ہر چیز قرینے سے بنائی گئی ہے۔ خوبصورت روشیں اور گزرگاہیں جن کے دونوں طرف سایہ دار درختوں کی قطاریں ہیں۔ نہریں باغ کے ہر حصے کو سیراب کرتی ہیں۔ تالاب اور فوارے ان باغات کی کشش اور خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں"۔

کشمیر کی دل کشی، شادابی اور ہریالی، پھلوں سے لدے باغات اور اناج پیدا کرنے والے کھیتوں، کھلیانوں کا تذکرہ ایک خوشحال کشمیر کا تصور ذہن میں لاتا ہے۔ لگتا ہے کہ مغلیہ عہد کا کشمیر نسبتاً خوشحال اور خود کفیل تھا جبکہ قبل ازیں اکبری عہد میں فادر ژاویر کے سفرنامے کی ذیل میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ قحط اور افلاس نے کشمیریوں کو اپنے بچے فروخت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فادر ژاویر اور برنیئر کے مشاہدات میں اس تضاد کی وجہ سے غالباً یہ ہے کہ فادر ژاویر کے سفر کشمیر کے عرصہ میں شاید وقتی طور پر کسی وجہ سے ریاست قحط کی صورت حال سے دوچار تھی جس کا رونا ژاویر نے رویا ہے ورنہ عام طور پر کشمیر اپنی فطری زرخیزی کے باعث ہمیشہ ایک خوشحال ریاست رہی ہے۔ جس کی نقشہ کشی برنیئر نے کی ہے۔

"کشمیر دنیا کا وہ خطہ ہے جہاں محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں"

یہ بھی ایک دلچسپ مگر تلخ حقیقت ہے کہ کشمیر اور کشمیریوں کی جس قدر دل کھول کر برنیئر نے تعریف کی ہے، بعد کے غیر ملکی سیاحوں کی تحریروں میں وہ شدت نہیں ملتی۔ خصوصاً

مور کرافٹ اور فاسٹر نے اہلِ کشمیر کے بارے میں جو منفی تاثر قائم کیا ہے، اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ دونوں سیاح افغانوں اور سکھوں کے عہد میں کشمیر وارد ہوئے تھے۔ جب مغلیہ عہد کی حسین یادیں قصہ ماضی بن چکی تھیں اور اس دور کی شاندار عمارات اور باغات پر کہنگی فرسودگی کے منحوس سائے لہرا رہے تھے۔ کشمیری عوام بھی افغانوں اور سکھوں کے مظالم کا بُری طرح شکار تھے اور غلامی نے ان کی فطرت کو مسخ کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مور کرافٹ اور فاسٹر کے کشمیر میں نہ تو تین چار منزلہ خوبصورت مکانات ہمیں نظر آتے ہیں، نہ ہری پربت کے دامن میں شاہی عمارات کی شان وشوکت دکھائی دیتی ہے اور نہ نشاط اور شالامار باغ پر جوانی کی بہار ہے۔

برنیئر لکھتا ہے۔

"سری نگر میں باغات کا طویل سلسلہ اور ڈل کی سطح آب پر رنگ ونور کا سیلاب ہے"

یہ سب کچھ صرف مغلیہ عہد تک تھا اور پھر ایک دھوپ تھی، جو ساتھ گئی آفتاب کے ذہانت اور قابلیت کے ایسے مجسمے، خوبصورت خدوخال اور رنگ وروپ والے کشمیریوں کے تذکرے ہمیں بعد کے سیاحوں کے سفرناموں میں نہیں ملتے، بلکہ ان کی جگہ بھوک اور ننگ کے مارے ہوئے انسانی ڈھانچے نظر آتے ہیں جن پر غربت اور افلاس کے سائے مسلط ہیں اور جن کا ذکر فاسٹر اور مور کرافٹ سمیت بعد کے تمام سیاحوں نے کیا ہے جو اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔

ملاؤں کی کرامت

یہ بات مسلمہ ہے کہ عوام کی اکثریت عجب پسند ہوتی ہے۔ وہ عجیب وغریب اور محیر العقول باتوں کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں اور بلا تحقیق وتفتیش ہر انوکھی بات کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ عوام الناس کی بڑی تعداد بعض بظاہر خارق عادت باتوں کو

اپنے عقائد و ایمانیات کے دائرے میں داخل کر لیتی ہے۔

برنیئر کا مربی دانشمند خان صحیح معنوں میں اسم با مسمیٰ تھا۔ قسام ازل نے اسے تحقیق و جستجو کے جوہر سے خوب نوازا تھا۔ وہ ہر انہونی اور انوکھی بات کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھنے کا عادی اور سائنسی ذہن کا حامل شخص تھا۔ وہ ہر معاملے میں ''کیا''، ''کیوں''، ''کب'' اور ''کیسے'' کے سوالات اٹھاتا تھا۔ ان دنوں کشمیر میں ایک مسجد کے بارہ ملاؤں کا بڑا چرچا تھا۔ جو ایک بھاری بھر کم پتھر محض اپنی انگلیوں پر اٹھا کر اپنی کرامت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ بیماروں کو چند دن میں بھلا چنگا کر دیتے تھے۔ یوں ان کی کرامتوں کا شہرہ دور و نزدیک پھیلا ہوا تھا چنانچہ دانشمند خان نے برنیئر کو اس عجیب و غریب معاملے کی چھان بین کے لیے روانہ کیا۔ برنیئر ان ملاؤں، ان کے مریدوں اور زیر علاج لوگوں سے ملنے اور پتھر اٹھائے جانے کا بچشم خود مشاہدہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ جہاں تک علاج کا تعلق ہے، ملا حضرات غریب اور بھوکے مریضوں کو اچھا کھانا کھلاتے ہیں جس سے وہ بھلے چنگے ہو جاتے ہیں۔ پتھر اٹھانے کا کام ملا اس مہارت سے کرتے تھے کہ وہ صرف انگلیوں ہی کا نہیں بلکہ پورے جسم کا زور ایک خاص ترکیب اور زاویے سے صرف کرتے تھے کہ سادہ لوح اور خوش گمان لوگ اسے ان کی کرامت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ برنیئر کے اس متجسسانہ انداز سے ملا شک و شبہ میں پڑ گئے اور انہیں اپنا بھانڈا پھوٹنے کا خدشہ لاحق ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ برنیئر سے سختی سے نمٹتے اس نے خود ہی خطرے کی بو سونگھ کر ملاؤں کی نظروں سے اوجھل ہو جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

نور جہاں کی یادیں

بعد ازاں برنیئر جنوبی کشمیر میں ویری ناگ، اچھابل اور بیج بہاڑہ میں مغلیہ باغات کی سیر کرنے نکل کھڑا ہوا۔ اچھابل کے چشموں اور آبشاروں نے اس کا دامن دل اپنی طرف کھینچا چنانچہ اپنے سفرنامے میں وہ ان چشموں کی روانی آبشاروں کی جوانی اور

باغوں اور کھیتوں کی ہریالی کا ذکر کر کے اس دور کے کشمیر کی ایک خوبصورت تصویر قارئین کے سامنے لاتا ہے۔ دریائے جہلم کے منبع ویری ناگ کے چشمے کے تازہ اور شفاف پانی میں تیرتی ہوئی حسین وجمیل مچھلیاں اس کی نگاہوں کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں۔ معاً اسے اس رومان پرور ماحول میں جہانگیر اور نور جہاں کی محبت کا افسانہ یاد آجاتا ہے۔ اسے ایک مچھلی کی گردن میں حلقہ ساز دلبری نظر آتا ہے یہ سونے کا ایک رِنگ ہے۔ جو دو نسلیں قبل نور جہاں نے ان مچھلیوں کے آباؤ اجداد میں سے کسی کے گلے میں ڈالا تھا۔ گویا سونے کا نیکلس اب ان مچھلیوں میں نسل درنسل منتقل ہوتا چلا جا رہا تھا، بقول حیدر علی آتش۔

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گُل ، سوز ربکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

امرناتھ یاترا کی خواہش ناتمام

جنوبی کشمیر کے خوبصورت چشموں اور باغات کا نظارہ کرنے کے بعد برنیئر ہندوؤں کے مقدس مقام امرناتھ کا مشہور غار دیکھنے کا متمنی ہے۔ حُسنِ فطرت کے جلوے جابجا بکھرے پڑے ہوں تو کس کافر کا دل نہ چاہے گا ان سے لطف اندوز ہونے کو۔

حُسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لیے
ہوں اگر بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

لہذا وہ جنگلات سے ڈھکے ہوئے بلند و بالا ہمالیائی پہاڑی سلسلوں میں اس غار کو دیکھنے جانا چاہتا تھا۔ اس غار کو اگر ہندوؤں کے مقدس مقام کا مرتبہ نہ بھی حاصل ہوتا تو بھی فطرت کے پرستاروں کے لیے بہت محترم ہوتا۔ ابھی وہ سفر کی تیاری کر رہا تھا کہ سری نگر سے ایک پیادہ دانشمند خان کا بلاوا لے کے آن پہنچا۔ دانشمند خان کو کسی خاص معاملے میں اس کی مشاورت مطلوب تھی۔ چنانچہ اس کے حکم کی تعمیل میں برنیئر کو فوراً سری نگر پہنچنا پڑا اور

امرناتھ دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں گھٹ کر دم توڑ گئی۔

جدید سری نگر کی سیر

سری نگر واپس پہنچنے کے بعد برنیئر سری نگر کے (اس دور کے) فیشن ایبل اور جدید گھرانوں کے طرز بود و باش اور روزمرہ کے معمولات کی ایک جھلک دیکھنے کا متمنی تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ سری نگر کے مکینوں کے گھروں تک رسائی کیسے حاصل کرے۔ ایک عمر رسیدہ کشمیری نے اس کی یہ مشکل حل کر دی اور اسے اپنے ساتھ مختلف گھروں میں لے گیا جہاں وہ مقامی آبادی میں گھل مل گیا۔ بوڑھے کشمیری نے اس کا تعارف اپنے ایک دولت مند اور شادی کے خواہشمند عزیز کے طور پر کرایا جو بچپن سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں کاروباری مصروفیات کے باعث مقیم تھا۔ اس وجہ سے کشمیری زبان نہیں بول سکتا تھا۔ کشمیری مرد و خواتین نے اسے بھولا بسرا عزیز سمجھ کر اس کی آؤ بھگت کی۔ مقامی آبادی کے ساتھ گھل مل کر برنیئر نے اپنے مشاہدے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"There are as handsome faces in Kachmeir as any part of Europe" in

(کشمیریوں کے چہرے ایسے ہی حسین ہیں، جیسے یورپ کے کسی حصے کے رہنے والوں کے ہو سکتے ہیں)

1665ء کے موسم خزاں میں شاہی قافلہ واپس دہلی روانہ ہوا۔ برنیئر کی سفر پسند طبیعت کو دہلی دربار کی غلام گردشوں میں زیادہ عرصہ قیام گوارا نہ ہوا۔ دہلی پہنچ کر اس نے دانشمند خان کی ملازمت ترک کر دی اور کلکتہ اور بنگال کی سیاحت پر نکل کھڑا ہوا۔ بنگال کے سفر میں مشہور فرانسیسی سیاح تیورنیئر (Tavernier) بھی اس کا ہمرکاب تھا جو چھٹی مرتبہ ہندوستان کی سیاحت پر آیا تھا۔

ستی کی رسم

ہندوستان وارد ہونے کے آٹھ سال بعد 1667ء میں برنیئر سورت کے ساحل پر وطن روانگی کے لیے ایک جہاز کا منتظر تھا۔ یہاں ایک اور مشہور سیاح جان چراؤن سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ جان چراؤن ہیروں کا تاجر تھا۔ بعد میں وہ برطانیہ کے بادشاہ چارلس دوم کا شاہی جوہری بھی رہا۔ ان دونوں کی ملاقات بھی ایک عجیب وغریب ماحول میں ہوئی۔ سورت کے ساحلی شہر میں ایک ہندو کی موت پر اس کے ہمراہ اس کی جوان بیوی کو بھی زندہ نذر آتش کیا جا رہا تھا۔ اس رسم کو "ستی" کہا جاتا ہے۔ دونوں یورپی سیاح ایک دوسرے کی موجودگی سے بے خبر اس ماتمی ہجوم میں شامل تھے جو اس بدقسمت ہندو لڑکی کو اس کے شوہر کے ساتھ جلائے جانے کا مذہبی فریضہ ادا کر رہا تھا۔ وہ دنوں اس دلخراش منظر کو دیکھ کر مایوس وافسردہ تھے۔ مذہبی رسم ادا کر کے ہندوؤں کا ہجوم تو چھٹ گیا لیکن دونوں سیاح اتفاقاً ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے اور یوں دشت غربت میں دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔

ہندوستان سے روانگی کے بعد کچھ عرصہ اس نے ایران میں بھی سیاحت سے ذوق قلب ونظر کی تسکین کا سامان کیا اور ملکوں ملکوں گھومتا پھرتا یہ بنجارہ مزید دو سال بعد پیرس واپس پہنچ گیا۔ 1672ء میں اسکا سفرنامہ ایمسٹرڈم سے شائع ہوا جو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ 1688ء میں اس کی وفات ہوئی اور اس کی تجہیز وتکفین کا اہتمام اس کے دوست ڈی ہربلوٹ (D.Herbelot) نے کیا جو مشہور زمانہ مستشرق تھا اور جس نے علوم شرقیہ کی ایک لغت مرتب کی جیسے کشمیر کے بارے میں لکھی جانے والی انگریزی کی مشہور زمانہ رومانوی نظم ,,لالہ رخ،، کا ایک اہم ماخذ بھی تصور کیا جاتا ہے۔

۸

کشمیر کی بہاروں کا آخری گواہ

فادر ڈی سدری

برنیئر کے نصف صدی بعد ایک پرتگیزی مشنری ڈی سدری کا گزر وادی کشمیر سے ہوا۔ ڈی سدری نہ تو کشمیر کی سیاحت کے لیے آیا تھا نہ یہاں عیسائیت کی تبلیغ اس کا مشن تھا۔ وہ گواہ سے لہاسہ (تبت) جا رہا تھا اور وادی کشمیر اس کے راستے میں آتی تھی۔ جونہی اپنے سفر کے دوران **1714**ء میں وادی کشمیر پہنچا، شدید برف باری شروع ہوگئی اور اس کے لیے سفر جاری رکھنا دشوار ہوگیا۔ یوں اسے موسم سرما کشمیر میں گزارنا پڑا۔ سری نگر میں اس کا قیام قریباً چھ ماہ پر محیط ہے۔ یہ عرصہ اس نے سری نگر میں کرائے کا مکان لے کر گزارا۔ ڈی سدری کی طرف سے اہل کشمیر کو مشرف بہ مسیحیت کرنے کی کسی سنجیدہ کوشش کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اول تو یہ بیچارہ پادری کشمیر پہنچتے ہی دست کی بیماری کا شکار ہو کر صاحب فراش ہوگیا اور موسم سرما کی کڑاکے کی سردی اس پر مستزاد۔ ایسے میں مسیحیت کی تبلیغ بیچارہ کرتا بھی تو کیسے

کرتا؟ اور دوسرے یہ کہ اس سے پہلے پرتگیزی مسیحی مشنریوں کی تبلیغی مساعی کا انجام اس کے سامنے تھا۔ ایسے میں اس نے شاید ایسی سعی لاحاصل سے اجتناب میں ہی عافیت جانی ہو۔

ڈی سدری نے کشمیر کے گورنر کو دہلی کے مغل حکمران کی طرف سے قیام کشمیر کا اجازت نامہ اور تعارفی خط بھی پیش کیا جس کی اس نے بھرپور پذیرائی کی۔ اس دوران یہ مسیحی مبلغ فارسی زبان سیکھنے کی مشق کرتا رہا۔ کشمیر کے حکمران نے اس میں اس کی ہر ممکن معاونت کی اور قیام کشمیر کے دوران میں اس کے آرام و آسائش اور اس کی ضرورتوں کا پورا پورا خیال رکھا۔ کشمیر کے بارے میں پادری ڈی سدری کے مشاہدات بھی برنیئر کے مشاہدات و تاثرات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔ برنیئر کی طرح اس نے بھی اس خطہ جنت نظیر کے حُسن و جمال اور اس کے باشندوں کی مہمان نوازی، فیاضی اور دوسری خوبیوں کی تعریف و توصیف میں کسی بُخل سے کام نہیں لیا۔ اس دور کے خوبصورت اور خوشحال سری نگر کا نقشہ وہ یوں کھینچتا ہے:

> ''ایک بڑا دریا شہر کے بیچوں بیچ بہتا ہے۔ قریب ہی بڑی اور خوبصورت جھیلیں ہیں۔ انسان چھوٹی بڑی کشتیوں کے ذریعے کشتی رانی سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ ان جھیلوں کے کناروں پر خوبصورت باغات شہر کی خوبصورتی کو دوبالا کرتے ہیں۔ شہر عظیم الشان عمارات اور ایک خاص ترتیب اور سلیقے سے بنائی گئی گلیوں، بازاروں اور پلوں پر مشتمل ہے۔ تاجروں، اور حتیٰ کہ عام شہریوں کے گھر بھی تراشیدہ پتھروں اور اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں۔ ان مکانوں پر لکڑی کی خوبصورت کندہ کاری کی گئی ہے۔ شہر سری نگر کے گرد پھیلا ہوا سارا علاقہ نہ صرف خوبصورت ہے بلکہ زرخیز بھی ہے۔ مختلف فصلوں اور پھلوں کی کاشت یہاں کثرت سے ہوتی ہے۔ یورپ میں پائے جانے والے پھولوں کی اقسام جو مغلیہ سلطنت

میں کہیں دستیاب نہیں یہاں پائی جاتی ہیں۔ گلاب، چنبیلی، نرگس، کنول
اوراس قسم کے دوسرے پھول یہاں کثرت سے ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے
کہ مغلیہ سلطنت کا ہر باسی کشمیر کو بجا طور پر جنت ارضی قرار دیتا ہے"۔

مئی میں جب پہاڑی دروں سے برف پگھل گئی تو فادر ڈی سدری اپنی منزلِ مقصود، لہاسہ (تبت) کی طرف روانہ ہوا۔ جنت ارضی کشمیر سے نکل کر لداخ کے سبزہ و گیاہ سے محروم دشوار گزار پہاڑی سلسلوں کو عبور کرتا ہوا وہ لہاسہ پہنچا۔

ڈی سدری وہ آخری یورپی سیاح ہے جس نے کشمیر کی بہاروں کے حُسن، چشموں کی روانی، پھلوں کی فراوانی، باشندگان ریاست کی خوشحالی، شہر سری نگر کی شان وشوکت، نشاط و شالیمار باغ کی رعنائی اور پری محل کی رونقوں کا مشاہدہ کیا۔ بعد کے سیاحوں کو یہ سب کچھ کھنڈرات کی صورت میں ملا کیونکہ کشمیر کی عظمت کا سورج اس کے بعد گہنا گیا تھا۔ غلامی کے منحوس سائے ایسے دراز ہوئے کہ اس جنتِ ارضی کی عظمتِ رفتہ آج تک لوٹ کر نہیں آسکی۔

۹

ایک بے برگ وساماں جہان گرد

جارج فاسٹر۔

اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان کی مغلیہ سلطنت زوال کا شکار ہوگئی۔ جگہ جگہ یورشوں اور بغاوتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ کہیں مرہٹے اور کہیں سکھ مرکزی حکومت کے خلاف صف آرا ہوگئے ۔عظیم مغلیہ سلطنت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹکڑوں میں تقسیم ہونے لگی۔ان حالات میں جبکہ سارا ہندوستان طوائف الملوکی اور خوفناک قسم کی خانہ جنگی کا شکار تھا، کسی یورپی سیاح کے لیے کشمیر جیسے دور افتادہ پہاڑوں اور جنگلوں سے ڈھکی ہوئی ریاست کا سفر اختیار کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ پنجاب جو کشمیر کے لیے صدر دروازہ تھا سکھوں اور افغانوں کے درمیان خوفناک جنگ کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ان حالات میں بھی بعض تاجر اپنی جانوں پر کھیل کر اپنے تجارتی قافلے کشمیر لاتے اور لے جاتے رہے۔اس مقصد کے لیے نئے حالات کے تناظر میں وہ ہمالیہ کی ڈھلوان کے ساتھ ساتھ چلنے والا راستہ اختیار کرتے تھے جو ہندوستان کو کشمیر سے ملاتا تھا۔ یوں پنجاب کا وہ حصہ جو اکثر میدان جنگ ہوتا تھا ان کے راستے میں نہیں پڑتا تھا۔یہی

تجارتی راستہ بعض تبدیلیوں کے بعد اب سری نگری دہلی شاہراہ ہے۔ یہ راستہ اگرچہ طویل اور دشوار گزار تھا لیکن سکھوں اور افغانوں کی دست درازیوں اور لوٹ مار سے بڑی حد تک محفوظ تھا۔ تب ریاست جموں وکشمیر نے بھی ایک سیاسی وحدت کی شکل اختیار نہیں کی تھی جو کہ آج ہمیں نظر آتی ہے۔ اس وقت کشمیر سے مراد صرف وادی کشمیر یا زیادہ سے زیادہ ملحقہ پہاڑی اضلاع تھے۔ اگر سری نگر میں تخت نشین حکمران مضبوط ہوتا تو وہ اپنی سلطنت کا دائرہ جموں اور لداخ تک وسیع کر لیتا تھا۔ جیسا کہ للتا دتیہ اور سلطان زین العابدین بڈشاہ وغیرہ کے ادوار میں اس ریاست کی سرحدیں بہت پھیل گئی تھیں۔ یہاں تک کہ سرہند اور کابل تک کے علاقے اس قلمرو میں شامل ہو گئے تھے۔ اگر سری نگر کا حکمران کمزور ہوتا تو یہ سرحدیں سکڑتے سکڑتے وادیء کشمیر تک محدود ہو جاتی تھیں۔

دہلی کی مرکزی حکومت کی شکست وریخت اور کسی طاقتور حکمران کی عدم موجودگی نے ریاست جموں وکشمیر کو بھی خانہ جنگی کی آگ میں جھونک دیا تھا۔ جموں، ڈوڈہ، بھدرواہ، کشتواڑ اور لداخ وغیرہ کے علاقوں میں جا بجا چھوٹی چھوٹی مملکتیں وجود میں آنے لگی تھی جو باہم دست وگریبان رہتی تھیں۔ مختلف قبائل ایک دوسرے کے مقابلے میں حالت جنگ میں رہنے لگے اور ہندوستان کی طرح یہ خطہ بھی ایک بڑی خانہ جنگی کے دہانے پر آ پہنچا۔ راستوں میں جگہ جگہ راہزنوں سے سابقہ پڑتا تھا اور مسافر اپنی جان بچانے کے لیے اپنا زادِراہ تک راہزنوں کے حوالے کر کے ان سے خلاصی پاتے تھے۔ ان حالات میں سیاحت کے ذوق کی تسکین ایک مشکل امر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈی سدری کے بعد نصف صدی سے زائد عرصہ تک کشمیر کی سیاحت کرنے والے کسی غیر ملکی مہم جو کی کسی کوشش کا سراغ نہیں ملتا۔

جارج فاسٹر وہ پہلا سیاح ہے جس نے خاموشی کے اس طویل وقفے کو توڑا اور 1786ء میں عازم کشمیر ہوا۔ جارج فاسٹر ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا اور مدراس میں

تعینات تھا۔ اس نے اپنے وطن انگلستان جانے کے لیے ایک عجیب وغریب راستے کا انتخاب کیا۔ سیر وسیاحت کا دلدادہ یہ شخص برطانوی ہند، کشمیر اور کابل سے ہو کر بحیرہ کیسپین کو عبور کر کے سینٹ پیٹرز برگ کے راستے انگلستان پہنچنا چاہتا تھا۔ اس قدر دشوار گزار، پر پیچ اور انجانے راستوں پر اس نے تنہا سفر کیا۔ زیادہ تر پیدل سفر کرتا تھا۔ کبھی کبھار گھوڑے یا اونٹ کی سواری کی سہولت بھی مل جاتی تھی۔ کچھ سفر اس نے اونٹ کی کوہان پر رکھی ہوئی پالکی نما ہودے میں بیٹھ کر بھی کیا۔ گاہے وہ مختلف تجارتی قافلوں کا ہم سفر بھی بن جاتا تھا۔ جو اسے بحفاظت ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچا دیتے تھے۔ اس کا سامان سفر نہایت مختصر تھا جو تمباکو سُلگانے والے ایک پائپ، ایک پتلے سے گدے، کینوس کے ایک تھیلے (جس میں ایک دو جوڑے کپڑوں کے تھے) اور ایک کمبل پر مشتمل تھا۔ شام کے اوقات میں پائپ سلگا کر کش لینا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ یہی سگار پائپ اس کا مونس وغم خوار تھا اور سفر وحضر کی تنہائیوں کا ساتھ بھی۔ کمبل وہ کبھی دوران قیام اوڑھ لیتا تھا اور کبھی دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لیے ایک ڈنڈے کی مدد سے اسے خیمے کی شکل میں اپنے اوپر تان کر ستا لیتا تھا۔ برف پوش پہاڑوں، بیاباں جنگلوں، دشوار گزار چٹانوں، تنگ پہاڑی دروں، سرسبز و شاداب وادیوں، تپتے صحراؤں، تیز رفتار دریاؤں اور بحیرہ کیسپین جیسے سمندروں سے اس کا گزر اس حال میں ہوا کہ زمین اس کا بچھونا تھا اور آسمان اس کا سائباں۔ یہ دعا تو غالب نے شاید اپنے حق میں مانگی تھی لیکن قبول جارج فاسٹر کے حق پہلے ہی ہو چکی تھی۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ہمیں تو اس بے برگ و ساماں مسافر کے بے سنگ و میل سفر پر رشک آتا ہے لیکن اسے فقر و درویشی کا یہ تجربہ شاید بڑا مہنگا پڑا۔ وہ قدم قدم پر مشکلات کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کا سفرنامہ کسل و رنج کا مرقع ہے۔ اپنے سفرنامے میں وہ سفر کی دشواریوں، راستے کی تلخیوں، موسموں کی شدت، سامان سفر کی عدم دستیابی، مکھیوں مچھروں کی یورش، دشت و بیاباں کی آبلہ پائی اور اہلِ جہاں کی بے اعتنائی کا رونا روتا ہے۔ اپنے بعد آنے والے سفر نصیبوں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''میری طرح کوئی سفر نہ کرے۔ سفر کے خواہش مند کے پاس کافی سامان سفر ہونا چاہیے۔ لیکن اتنا زیادہ بھی نہیں کہ اسے ٹیکس اور دوسرے جھمیلوں میں مبتلا ہونا پڑے''۔

فاسٹر نے یہ سارا سفر بھیس بدل کر کیا تھا کیوں کہ طوائف الملوکی کے اس دور میں اپنی اصلیت ظاہر کر دینا موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا۔ وہ چونکہ سفید فام یورپی تھا اس لیے اسے اپنے بارے میں ایسی کہانی گھڑنی پڑی جس میں اس کی سفید رنگت کا جواز بھی نکل سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو ترک نژاد مسلمان ظاہر کیا جو ہندوستانی فوج میں طویل عرصے تک خدمات انجام دینے کے بعد فوجی ملازمت سے اکتا چکا تھا اور اب ملکوں ملکوں گھوم پھر کر تجارت کرنا چاہتا تھا۔ اس کہانی کا مضحکہ خیز پہلو ایک حقے اور ایک سیاہ کمبل پر مشتمل اس کا زادِ راہ تھا۔ بھلا ایک بین الاقوامی تاجر کا اسباب سفر یہی ہوتا ہے؟ بہر حال شاید اس کی اس کہانی پر اس دور کے سادہ لوح لوگوں نے اعتبار کر لیا تھا اور مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے اسے لوگوں کی طرف سے کسی قسم کی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی مشکلات کا سبب خود اس کی اپنی قناعت پسند طبیعت تھی ورنہ سفر اس قدر کٹھن نہ گزرتا۔

فاسٹر روزمرہ ڈائری باقاعدگی سے لکھتا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ کسی تجارتی قافلے

کے ساتھ ہوتا، ہمسفروں کے سامنے اپنے آپ کو ترکی نژاد ظاہر کر کے صورت حال پر قابو پالیتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اپنی ڈائری لکھنے میں مصروف تھا کہ ایک ہمسفر نے اس سے پوچھ لیا کہ وہ دائیں سے بائیں لکھنے کی بجائے یورپی طرز پر بائیں سے دائیں کیوں لکھ رہا ہے۔ تو اس نے جواب دیا کہ وہ ترکی زبان میں لکھ رہا ہے جو بائیں سے دائیں لکھیں جاتی ہے۔ حالانکہ اس وقت ترکی زبان بائیں سے دائیں نہیں بلکہ اردو، عربی اور فارسی کی طرح دائیں سے بائیں لکھی جاتی تھی لیکن اس نے پوچھنے والے کی کم علمی اور اپنی حاضر دماغی کا فائدہ اٹھا کر اپنا یورپی ہونا ظاہر نہیں ہونے دیا۔ جارج فاسٹر کی یہ بات مصطفیٰ کمال پاشا کے جدید ترکی میں درست ثابت ہوگئی کہ تب سے ترکی زبان بھی انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کی طرح بائیں سے دائیں لکھی جانے لگی۔

اٹھارھویں صدی کا کشمیر

1773ء کے موسم بہار میں وہ کشمیر پہنچا۔ کشمیر پر افغانوں کی حکومت تھی۔ مغلیہ دور کا حُسن ماند پڑ چکا تھا، نشاط و شالیمار باغ افسردہ ہو چکے تھے، پری محل اور مغلیہ دور کی دوسری یادگاروں کی چمک دمک قصہ ماضی بن چکی تھی۔ اب نہ وہ سیاحوں کی آؤ بھگت تھی، نہ شہریوں کی وہ خوشحالی اور فارغ البالی، باشندگان ریاست کا حُسن بھی افغانوں کے ظلم کی وجہ سے پھیکا پڑ چکا تھا۔ ہر طرف نحوست کے سائے رقص کر رہے تھے۔ ایک طرف کشمیر کی یہ عمومی صورت حال اور دوسری طرف فاسٹر کہتا ہے کہ وہ اس رات نمونیے سے مر گیا ہوتا اگر اس کا ہمسفر سموکنگ پائپ اس کی اس یخ بستہ شب کا ساتھی نہ ہوتا۔ اس نے ساری رات پائپ کے کش لگاتے ہوئے گزار دی۔ سری نگر پہنچتے ہی اس قسم کی تکلیف دہ صورت حال سے سابقہ پیش آنے کے باوجود کشمیر کے خوبصورت مناظر نے اسے بہت متاثر کیا۔ یہ بہار کے رومان پرور اور جنوں خیز دن تھے۔ گلاب اور چنبیلی کے پھول جا بجا کھلے ہوئے تھے اور

ساری وادیٔ کشمیر حُسنِ فطرت کا ایک خوبصورت منظر پیش کر رہی تھی ۔ مناظر کی خوبصورتی اور رنگینی کو بیان کرتے ہوئے فاسٹر کہتا ہے:

''ایسا لگتا ہے جیسے ملک پرستان کے کسی صوبے میں آ گیا ہوں،،

سلیقہ مند ظالم

اس وقت اٹھارہ سالہ آزاد خان کشمیر کا گورنر تھا جو اپنے باپ کے مرنے کے بعد کشمیر کا گورنر بن کر آیا تھا۔لوٹ مار اور خوف و ہراس کی وہ فضا تھی کہ آزاد خان یا اس کے باپ کا نام ہی خوف و دہشت کی ایک علامت بن گیا تھا۔ فاسٹر نے آزاد خان اور اس کے باپ کے انداز حکمرانی کے بارے میں عوامی رائے بیان کی ہے کہ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ! آزاد خان کا باپ بھی ظلم میں اپنی مثال آپ تھا اور آزاد خان بھی اسی ظالم شخص کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اپنے باپ سے کس طرح کم نہیں تھا۔لیکن لوگوں کے بقول اس کا باپ اس لیے بہتر تھا کہ وہ ایک **Systematic tyrant** (سلیقہ مند ظالم) تھا یعنی وہ ظلم بھی کسی ''سلیقے'' اور ''قرینے'' سے کرتا تھا جبکہ اس کا بیٹا آزاد خان تو اندھا ظالم ہے جو سب کچھ تاراج کرتا چلا جاتا ہے۔فاسٹر کہتا ہے ''میں نے اس فطرت کا انسان کبھی نہیں دیکھا''۔اس موقع پر فاسٹر نے آزاد خان اور اس کے باپ کے مظالم کی کچھ جھلکیاں بھی پیش کی ہیں۔ مثلاً ایک ڈاکٹر کا پیٹ چاک کروا کر اس کا معدہ نکال کر باہر پھینکوا دیا کیوں کہ وہ اس کی آنکھ کا علاج کرنے میں ناکام رہا تھا۔ بھلا آنکھ اور معدے کا آپس میں کیا تعلق؟ لیکن کس میں جرات تھی کہ جو آزاد خان سے یہ بات پوچھ سکتا؟ اس طرح اس نے اپنی بیوی کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ایک مرتبہ اپنے استقبال کے لیے جمع ہونے والے ہجوم میں شامل ایک شخص کو محض اپنے نشانہ بازی کے ذوق کی تسکین کے لیے فائر کر کے ہلاک کر دیا وغیرہ وغیرہ۔

کشمیریوں کے متعلق فاسٹر کی رائے

کشمیر کے باشندوں کے بارے میں فاسٹر کی رائے اپنے پیش روسیاحوں سے مختلف ہے۔ وہ کشمیریوں کو پسند نہیں کرتا اور انہیں اعلیٰ اخلاقی کردار اور اقدار کا حامل نہیں سمجھتا۔ جارجیا کا ایک تاجر، جو ایک طویل عرصے سے بسلسلہ تجارت کشمیر میں مقیم تھا اور اس نے کشمیر کے اچھے دور کا بھی مشاہدہ کیا تھا، فاسٹر کو بتاتا ہے کہ کشمیری ہمیشہ سے ویسے نہیں تھے جیسا کہ فاسٹر ان کے بارہ میں خیال کرتا ہے۔ افغانوں کے ظلم و جبر کے دور سے قبل جب کہ انہیں نسبتاً آزادی کی فضا میسر تھی، یہی اہلِ کشمیر علم و فن کے دلدادہ، ذہانت اور فطانت میں یگانہ روزگار اور محبت و ہمدردی اور جود وسخا میں بے مثال تھے، لیکن اب غلامی کے تاریک اور منحوس ماحول نے ان کی فطرت مسخ کر کے رکھ دی ہے اور ان کے اوصافِ حمیدہ تک ان سے چھین لیے ہیں۔

تھا جو ناخوب بندریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

کشمیریوں کے بارے میں فاسٹر کی اس مخالفانہ رائے میں بڑا دخل سری نگر میں اس کے میزبان کے رویئے اور طرزِ عمل کا بھی تھا۔ سری نگر میں جو شخص فاسٹر کا میزبان بنا وہ اتفاق سے ایک پست ذہنیت کا لالچی، چاپلوس اور خودغرض انسان تھا جیسا کہ فاسٹر نے اس کی تصویر کشی کی ہے۔ اسے جب پتہ چلا کہ اس کا مہمان ایک دولت مند تاجر ہے تو وہ اس کے خوشامد اور چاپلوسی میں مصروف ہو گیا۔ فاسٹر کے اپنے الفاظ میں "وہ میری ٹانگیں دبانے سے خوشامد اور چاپلوسی کے اس سلسلے کا آغاز کرتا اور عرق گلاب سے میرا منہ دھونے پر اختتام کرتا ہے"۔

دریں اثناء ایک حقیقی تاجر کسی مغربی ملک سے آکر اسی میزبان کے ہاں قیام پذیر ہوا۔ فاسٹر کی چاپلوسی اور خوشامد کر کے یہ میزبان پہلے ہی تھک ہار کر مایوس ہو چکا تھا

لہذا اب اسے اس نئے میزبان کی صورت میں امید کی ایک کرن نظر آئی اور اسی انہماک کے ساتھ وہ نئے تاجر کی خوشامد، چاپلوسی اور خاطر مدارت میں لگ گیا۔ اس کے بعد اس نے فاسٹر کی طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر بھی نہ دیکھا جیسا کہ اس نے اس کی موجودگی کو ہی فراموش کر دیا تھا۔ اس شخص کی اس پست ذہنیت اور طرز عمل سے فاسٹر نے ساری کشمیری قوم کو اسی مزاج اور ذہنیت کا حامل سمجھ لیا۔

فاسٹر نے دو یا تین ہفتے کشمیر میں گزارے۔ حُسن فطرت اگر چہ اب بھی اپنی جوانی پر تھا۔ سری نگر شہر اب بھی خوبصورتی میں بے مثال تھا۔ چشموں کی روانی اور آبشاروں کا شور اب بھی رومان پرور تھا۔ پھولوں کی جوانی اور سبزہ زاروں کا حُسن اب بھی تر و تازہ تھا۔ لیکن اس عہدِ ستم میں اس جنتِ ارضی کے باشندوں کے چہرے مدقوق اور افسردہ تھے۔ مٹی میں لتھڑے ہوئے، چیتھڑوں میں ملبوس، میلے کچیلے، الجھے بالوں اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں والے نیم مردہ کشمیری ہمیں فاسٹر کے سفرنامے کے اوراق پر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

پروانہ راہداری

اس دور میں کوئی شخص گورنر کی تحریری اجازت کے بغیر کشمیر سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ لہذا اب اس نے اپنے سفر کی اگلی منزل یعنی کابل کی جانب روانگی کے لیے گورنر کو درخواست پیش کی جو مسترد کر دی گئی۔ آزاد خان نے اسے کشمیر کی فوج میں بھرتی کرنا چاہا کیونکہ ترک بنیادی طور پر اچھے سپاہی ہوتے ہیں (حالانکہ نہ وہ ترک تھا اور نہ سپاہی) خوش قسمتی سے اس وقت وہ دربار میں موجود نہ تھا۔ ورنہ اسے فوری طور پر فوج میں بھرتی کر لیا گیا ہوتا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے ایک اور درخواست اپنے ایک ہمدرد اور دربار میں اثر و رسوخ رکھنے والے شخص کی وساطت سے گورنر کو پیش کی۔ فاسٹر کی بدقسمتی کہ اس کا یہ دوست عین اس روز گورنر کی نظروں سے گر گیا جس دن وہ فاسٹر کی یہ درخواست گورنر کو پیش

کرنے والا تھا۔ بعد میں وہ شخص آزاد خان کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ اس صورت حال نے فاسٹر کو مایوسیوں کی انتہا تک پہنچا دیا۔ اب کی بار قسمت آزمائی کے لیے فاسٹر نے اپنے جارجیا سے تعلق رکھنے والے تاجر دوست کی وساطت سے گورنر کی خدمت میں کشمیر سے روانگی کے اجازت نامے کی درخواست پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاجر نے گورنر ہاؤس کے تقریباً پندرہ چکر لگائے اور پندرہویں مرتبہ منت سماجت کرکے گورنر سے اس ''ترک تاجر'' کے کشمیر چھوڑنے کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ فاسٹر خوشی سے پھولے نہ سماتا تھا لیکن ابھی آزمائش ختم نہیں ہوئی تھی۔

جہنم سے فرار

فاسٹر پروانہ راہداری سے ملتے ہی ایک گھوڑا کرائے پر لے کر سری نگر سے روانہ ہوگیا۔ بدقسمتی قدم قدم اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ جلد ہی اس کا کوٹ چوری ہوگیا جس میں گورنر کی طرف سے جاری کردہ پروانہ راہداری کی ''قیمتی دستاویز'' تھی۔ فاسٹر اس حادثہ فاجعہ کا ذمہ دار اپنے آپ ہی کو قرار دیتا ہے کہ اگر اس نے قیمتی سرخ کوٹ نہ خریدا ہوتا تو چوری جیسی یہ سنگین واردات نہ ہوتی اور نہ اجازت نامہ چوری ہوتا۔ اس کے باوجود فاسٹر واپس سری نگر جا کر نیا پروانہ راہداری حاصل کرنے پر تیار نہ تھا۔ اس نے آگے ہی بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ سرحدی محافظوں کو بھاری رشوت دے کر آزاد خان کے ''جہنم'' سے فرار حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہوگیا۔ اس نے اپنے طے شدہ عجیب وغریب راستے پر اپنا سفر جاری رکھا اور وسط ایشیاء اور بحیرہ کیسپین سے ہوتے ہوئے اگلے سال جولائی میں وہ انگلستان پہنچ گیا۔ اس کے سفر کی ان تلخ وشیریں یادوں پر مبنی سفر نامہ 1790ء میں شائع ہوا۔ فاسٹر نے واپس ہندوستان آکر اپنی زندگی کے آخری ایام ناگپور میں گزارے اور وہیں وفات پائی۔ اس کے سفرنامے کی دوسری جلد اس کی وفات کے بعد اس کے کاغذات سے برآمد ہوئی جو 1798ء میں شائع ہوئی۔

۱۰

ایک رومانوی نظم

لالہ رخ

نئ صدی کا سورج نئے امکانات، نئی امنگوں، نئے ولولوں اور نئے عزائم کے ساتھ طلوع ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں اپنی فتح کے جھنڈے کامیابی سے گاڑھ چکی تھی۔ برصغیر میں انگریزوں کا اقتدار مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جارج فاسٹر اور اس جیسے دوسرے لوگ جو کمپنی کی ملازمت کے دوران میں ہندوستان میں اقامت گزیں رہے، انھوں نے مغلیہ فن تعمیر کی دلکشی کے افسانے اپنے یورپی ہم وطنوں کے سامنے اس آب ورنگ سے پیش کیے کہ ہندوستان کے فن تعمیر کو دیکھنے کی خواہش اہل برطانیہ کے سینوں میں مچلنے لگی۔ شاہی خاندان بھی اس سلسلے میں کسی سے پیچھے کیوں رہتا۔ پرنس آف ویلز نے 1815ء میں جان ناش نامی ایک ماہر تعمیرات کو یہ مشن سونپا کہ وہ شاہی محلات اور شاہی باغات کی تعمیر نو اور تزئین و آرائش ہندوستانی طرز پر کرے۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے انگلستان کی سادہ اور سپاٹ عمارتوں کی جگہ مغلیہ فنِ تعمیر نے لے لی اور جا بجا مینارے، محرابیں اور گنبد تعمیر ہونے لگے، باغات لگنے لگے اور زندگی ایک نئی چہل پہل، ایک نئی ترتیب سے آشنا ہونے لگی۔ کشمیری شال تو برطانوی فیشن کا ایک لازمی جزو بن گیا۔ کوئی عورت اس وقت تک فیشن ایبل کہلانے کی مستحق نہیں سمجھی جا سکتی تھی جب تک اس کے

شانوں پر کشمیری شال یا دوشالہ نہ لہرار ہا ہوتا۔ ملکہ جوزفین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس دوسو قیمتی شالوں کا ذخیرہ تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مونالیزا کی مشہور زمانہ پینٹنگ جسے دنیا میں مصوری کا شاہکار ہونے کا اعزاز حاصل ہے، میں عورت نے جو شال اوڑھی ہوئی ہے وہ کشمیری شال ہی ہے۔

مغرب میں سونے کی چڑیا ہندوستان اور جنتِ ارضی کے بارے میں قصے کہانیاں فن تعمیر کے تذکرے باغوں اور بہاروں کے قصے اور باشندگان جموں وکشمیر کے لباس اور انداز واطوار کے بارے میں معلومات اس قدر عام ہو چکی تھیں کہ اب ہندوستان اور کشمیر اہل مغرب کے تصورات میں رچ بس گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور برطانوی مصنف اور شاعر تھامس مور نے جب 1817ء میں کشمیر کے بارے میں ایک رومانوی نظم ''لالہ رخ'' کے عنوان سے لکھی تو اسے مغرب میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ لالہ رخ کا مصنف تھامس مور آئرلینڈ کا رہنے والا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کشمیر تو کیا کسی بھی ایشیائی ملک کی سیاحت نہیں کی تھی۔ کشمیر کی جس قدر حقیقی تصویر کشی اس نے کی ہے اس سے اس کے تخیل کی جولانی کا اندازہ باآسانی کیا جاسکتا ہے۔ اس کی معلومات کا ابتدائی ماخذ برنیئر اور دوسرے سیاحوں کی زبانی حاصل ہونے والی معلومات اور خصوصاً D.Herblote کی مرتب کردہ علوم شرقیہ کی ڈکشنری ہے۔

تھامس مور کی بیان کردہ منظوم افسانوی داستان ''لالہ رخ'' کا کردار فرانکوئس برنیئر کے بیان کردہ اورنگ زیب عالمگیر کے سفر کشمیر کے دوران میں شاہی خاندان کی اہم ترین شخصیت روشن آراء بیگم سے ملتا جلتا ہے تاہم روشن آراء بیگم کی نسبت تھامس مور کی لالہ رخ ایک متحرک اور انسانی جذبات سے لبریز شخصیت ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ''لالہ رخ'' کے افسانے کی تاریخی حیثیت اور حقیقت کیا ہے؟ تھامس مور کی نظم میں بیان کردہ کہانی کا

خلاصہ یہ ہے کہ ''لالہ رخ'' مغل شہنشاہ کی چہیتی بیٹی ہے جس کی شادی کی تقریب شالیمار باغ سری نگر میں منعقد ہونی طے پائی ہے۔ اسی سلسلہ میں شاہی قافلہ سری نگر کی جانب رواں دواں ہے۔ شہزادی لالہ رخ کا قافلہ بڑی شان وشوکت اور آن بان سے دہلی سے سوئے کشمیر روانہ ہوتا ہے۔ راستے کی چند منزلوں کے بعد شہزادی لالہ رخ اُکتا جاتی ہے۔ اس کی اُکتاہٹ دور کرنے کے لیے قافلے سے ہی ایک خوبصورت اور خوش گلو کشمیری شاعر کو تلاش کرلیا جاتا ہے۔ اور اسے کہا جاتا ہے کہ وہ شہزادی کو اپنی نظمیں سنائے اور اسے رفاقت مہیا کرے۔ وہ شاعر شہزادی کو بڑے ترنم اور سوز سے نظمیں سناتا ہے۔ شہزادی اس کی وجیہ شخصیت، انداز واطوار، خوش اخلاقی اور خوبصورتی کے سامنے اپنا دل ہار بیٹھتی ہے اور اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

عشق ایسا جادو ہے کہ جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ چند ہی روز میں شہزادی کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ اس پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ رنگ پیلا پڑ جاتا ہے۔ وہ کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر، حکیم، ویداس کے علاج کے لیے بلائے جاتے ہیں لیکن ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' کا معاملہ ہے۔ دریں اثناء قافلہ سری نگر پہنچتا ہے۔ شہزادی ''لالہ رخ'' کو شالیمار باغ میں بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ ٹھہرایا جاتا ہے اور اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف بلکہ اس کے احتجاج کے علی الرغم طے شدہ پروگرام کے مطابق شہزادے سے کر دی جاتی ہے۔ شادی کی تقریبات شالیمار باغ میں دُھوم دھام سے منعقد ہوتی ہیں۔ لیکن شہزادی کی حالت غیر ہوئی جاتی ہے بالآخر شہزادی کی رخصتی ہو جاتی ہے اور وہ ٹوٹے دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ جب شہزادے کے حجلہ عروسی میں پہنچتی ہے

تو اس کی خوشگوار حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ وہی شہزادہ اس کا جیون ساتھی بن چکا ہے جو ایک شاعر کا بھیس بدل کر اس کا شریکِ سفر تھا اور جس کے عشق میں وہ گرفتار ہو چکی تھی۔

اہلِ مغرب ''لالہ رخ'' جیسی شاہکار نظم کے لیے کس درجہ مضطرب تھے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ مشہور پبلشر لانگ مین نے تھامس مور کو کتاب کا آغاز کرنے سے بھی پہلے ایک خطیر رقم دے کر کتاب کے حقوق اشاعت اپنے لیے محفوظ کرا لیے تا کہ اس کی اشاعت سے وہ بے پناہ مالی فائدہ اور شہرت حاصل کر سکے۔ 1817ء سے 1880ء تک جب لانگ مین کے حقوق اشاعت ختم ہوئے اس کتاب کے ایک لاکھ کے لگ بھگ نسخے بِک چکے تھے جو کہ اس دور کے تناظر میں ایک محیر العقول بات تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس کی ڈرامائی تشکیل بھی ہوئی۔ اسے پہلی مرتبہ 27 جنوری 1822ء کو سٹیج کیا گیا تو شائقین نے اسے بے حد سراہا اور اس کے بعد تو برطانیہ، فرانس، جرمنی اور دیگر ممالک میں اسے اتنی مرتبہ سٹیج کیا گیا کہ شاید ہی کسی سٹیج شو کو ایسی پذیرائی ملی ہو۔ شائقین کی دلچسپی کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی رہی۔

لالہ رخ کا یہ بند بطور نمونہ نذر قارئین ہے:۔

Who has not heard of cashmere,
With its roses, the brightest that earth ever gave,
Its temples, and grattos and fountains as clear,
As the lovelighted eyes that hang over their wave,
Think think what a heaven She must make a Kashmir.

۱۱

پرعزم آغاز، المناک انجام

ولیم مورکرافٹ

افغانوں کے عہد کے خاتمے اور سکھا شاہی قیام کے بعد جس یورپی باشندے نے سب سے پہلے کشمیر کا سفر کیا، وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا وٹرنری سرجن ولیم مورکرافٹ تھا۔ ولیم مورکرافٹ لنکا شائر کا رہنے والا تھا جس نے لیورپول (Liver Pool) سے سرجری کا امتحان پاس کیا تھا اور بعد میں لندن چلا گیا۔ اس کا ارادہ عمدہ گھوڑوں پر نسل کشی کے تجربات کرنے کا تھا دریں اثناء ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے بنگال میں فوجی اصطبل کے سپرنٹنڈنٹ کی ملازمت کی پیشکش کی۔ اس نے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور 1808ء میں اپنی اس نئی ملازمت پر بنگال پہنچا۔ اس نے اپنی ذمہ داریوں کو نہایت عمدگی سے نبھایا۔ جب اس نے اصطبل کا چارج سنبھالا تھا ہر آٹھ میں سے ایک گھوڑا بیمار تھا لیکن اس نے بڑی فرض شناسی اور پیشہ ورانہ مہارت سے دن رات ایک کر کے بیمار گھوڑوں کا علاج کیا۔ وہ خود لکھتا ہے کہ چند سال کے بعد شاید ہی کوئی گھوڑا اس کے اصطبل میں ایسا ہوا ہو جو بیمار ہو۔ لیکن طویل تجربے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ ہندوستانی نسل کے مقامی گھوڑے

فوجی خدمت کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہیں۔لہذا اس نے وسط ایشیاء سے عمدہ نسل کے گھوڑوں کی ہندوستانی گھوڑوں کے ساتھ کراس بریڈنگ کے ذریعے گھوڑوں کی ایک عمدہ نسل تیار کرنے کا منصوبہ بنالیا۔اگرچہ کمپنی کے حکام اس کے اس خیال کو زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہ تھے اوراس کے باوجود کہ گھوڑوں کی کراس بریڈنگ ،اور وہ بھی وسط ایشیائی گھوڑوں سے، اس کے فرائض منصبی میں بھی شامل نہ تھی لیکن وہ ایک پرعزم اور قومی خدمت کے جذبے سے سرشار ایک فرض شناس افسر تھالہذا اس نے اپنی ملازمت کا رسک لے کراس مشکل ترین کام کوممکن بنانے کا بیڑا اٹھالیا۔

اس مقصد کے لیے اس نے 1819ء میں براستہ کشمیر لداخ اور پھر کابل سے ہوتے ہوئے بخارا کا سفر اختیار کیا۔اس نے اپنے ایک قانون دان دوست کے بیٹے Terebeck اور ایک ہندوستانی ڈاکٹر گاتھری (Gothrie) کو اپنا ہمسفر بنایا ۔کرافٹ نے اپنے ہمراہ ایک ماہر ارضیات Geologist کو بھی لیا تھا لیکن ملازموں اور قلیوں کے ساتھ اس کا رویہ اتنا نامناسب تھا کہ آغازِ سفر میں ہی اس نے اسے اس ماہرِ ارضیات کی خدمات سے معذرت کرلی۔

قبل ازیں بھی ولیم مورکرافٹ تبت کا ایک خطرناک سفر کر چکا تھا۔اس سفر میں اس نے تبت سے اعلیٰ نسل کی بھیڑیں لائی تھیں جن سے عمدہ قسم کی اون حاصل کی جاتی تھی۔ یہ بھیڑیں اس نے لندن بھجوائی تھیں۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس مرتبہ اسے وسط ایشیاء کا سفر کرنے کی اجازت دینے میں کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔شاید کمپنی کے حکام کا خیال یہ تھا کہ مورکرافٹ کے پیش نظر وسط ایشیاء سے گھوڑوں کی فراہمی محض ایک بہانہ ہے، وہ دراصل اپنے ذوق جہاں گردی کی تسکین کے لیے یہ سفر اختیار کر رہا ہے حالانکہ یہ بات درست نہ تھی۔مورکرافٹ ایک متجسس، پرعزم، اختراع پسند اور انتھک انسان تھا جو اپنی جان جوکھوں

میں ڈال کر ملک وقوم کی خدمت میں مگن رہتا تھا۔ کمپنی کے حکام کی سرد مہری اس کے جذبہ خدمت کو سرد نہ کر سکی اور اس نے اس خطرناک سفر کا آغاز کر ہی دیا جو اس دور میں ایک ناممکن العمل بات سمجھی جاتی تھی۔

مورکرافٹ نے دوران سفر 1820ء سے 1822ء تک دو سال لداخ میں گزارے ایک سیاح کا اتنا طویل عرصہ ایک ہی علاقے میں قیام بہت سے سوالیہ نشان بھی کھڑے کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمپنی اس نتیجہ پر پہنچی کہ وہ لداخ کی سیاست میں ملوث ہو کر اپنے فرائض منصبی کی حدود سے تجاوز کر رہا ہے۔ لہذا کمپنی کے حکام نے اس امر کی شکایت بھی برطانیہ میں اپنے ہیڈ کواٹر کو کر دی تھی۔ دراصل مورکرافٹ لداخ میں اس منصوبے پر کام کر رہا تھا کہ لداخ کو کس طرح برطانیہ کی عملداری میں لایا جائے۔ اس سلسلہ میں اس نے لداخ کے حکمران کو بھی شیشے میں اتار لیا تھا اور وہ حکومت برطانیہ کا مطیع فرمان بن کر رہنے پر رضا مند ہو چکا تھا۔ اس نے حکومت برطانیہ کو لداخ کے حکمران کے ساتھ ہونے والی بات چیت اور اس کی رضا مندی سے بھی آگاہ کیا لیکن اس اقدام سے ایسٹ انڈیا کمپنی ناراض ہو گئی کیونکہ اس کے ایک ملازم نے اس کی اجازت کے بغیر اپنے فرائض منصبی سے تجاوز کیا تھا۔ یوں کمپنی نے یہ بیل منڈھے نہ چڑھنے دی۔

اس کے باوجود کہ مورکرافٹ لداخ کے حکمران کو ورغلا کر انگریزی حکومت کے ساتھ الحاق کرنے پر آمادہ کیا تھا لیکن اس کے اس اقدام پر بھی کشمیر کے سکھ حکمرانوں نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا بلکہ جب وہ لداخ سے 70 آدمیوں اور سینکڑوں گھوڑوں اور بھیڑوں کے قافلے کے ساتھ واپس سرینگر پہنچا تو سونا مرگ میں سکھ گورنر کے نمائندے نے اس قافلے کا شاندار استقبال کیا۔ تاہم جب مورکرافٹ کا قافلہ سری نگر کے بازار میں پہنچا تو ہزاروں مرد و خواتین کا ریلہ ان کی جانب امڈ آیا۔ اس انسانی ریلے کو وہ استقبالی ہجوم سمجھا

اور ہاتھ لہرا لہرا کر ان کا شکریہ ادا کرتا رہا لیکن جلد ہی اسے معلوم ہوا کہ یہ ہجوم اس کے استقبال کے لیے نہیں بلکہ اسے حکومت برطانیہ کا نمائندہ سمجھ کر سکھ حکمرانوں کے مظالم کی شکایت کرنے جمع ہوا تھا۔ لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر سکھ گورنر کے مظالم کی تفصیلات بیان کر رہے تھے اور ان مظالم سے نجات دلانے کے لیے انگریز حکام کو مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے حال ہی میں ایک ظالمانہ حکم جاری کیا تھا جس کی رو سے جب تک سرکاری خزانہ بھر نہیں جاتا کوئی شخص اپنی فصل پھل یا غلہ فروخت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ہجوم مہاراجہ رنجیت سنگھ کے اس ظالمانہ حکم کے خلاف سراپا احتجاج بنا ہوا تھا۔ مور کرافٹ نے مظلوم کشمیریوں کی بات پوری ہمدردی سے سنی اور ان کی حالت زار سے اس نے گہرا اثر بھی قبول کیا تاہم وہ ان کی کوئی دادرسی نہ کر سکا کہ اسے میزبان سکھ حکمرانوں کی خوشنودی بھی عزیز تھی۔

مور کرافٹ اور اس کے ساتھیوں کو جہانگیری عہد کے گورنر کشمیر دلاور خان کے باغ میں ٹھہرایا گیا۔ اگرچہ دلاور خان کا باغ سکھ حکمرانوں کی ناقدری اور غفلت کے باعث اجڑ چکا تھا تاہم شہر کے وسط میں خوبصورت محل وقوع پر واقع ہونے کے باعث اسے یہ بھی غنیمت لگا۔ سری نگر میں قیام کے دوران ہر وقت ضرورت مندوں میں گھرا رہتا، کوئی اسے انگریز افسر سمجھ کر سکھ حکمرانوں کے مظالم کی جانب متوجہ کرتا۔ کوئی اسے ڈاکٹر سمجھ کر علاج معالجہ کے لیے اس سے رجوع کرتا اور کوئی اپنے روتے بلکتے بھوکے بچوں کے لیے روٹی کا ٹکرا طلب کر رہا ہوتا۔

مور کرافٹ نومبر 1822ء میں سری نگر پہنچا۔ اب سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ پہاڑوں نے برف کی دبیز چادر اوڑھ لی تھی اور پہاڑی درے برفباری کے باعث بند ہو گئے تھے لہٰذا اس نے آنے والے موسم بہار تک کشمیر میں ہی قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے قیام کشمیر کی وجہ بنیادی طور پر یہ تھی کہ وہ کشمیر کی شال بافی کی صنعت کا تفصیلی مشاہدہ اور مطالعہ کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ برطانیہ میں اس صنعت کو رواج دے سکے۔ اس کے خیال

میں شال بافی بڑی نفع بخش صنعت تھی اور اس کے فروغ سے برطانیہ کو بے پناہ مالی فائدہ ہو سکتا تھا۔ اسی مقصد کے لیے قبل ازیں لداخ کی بھیڑوں کی ایک کھیپ وہ برطانیہ پہنچا چکا تھا جس کی نسل کشی سے وہ عمدہ بھیڑیں تیار کرنے اور ان سے عمدہ اون حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کر چکا تھا۔ یوں مور کرافٹ نے کشمیری شالوں کی تیاری کے مختلف مراحل کا تفصیل سے مشاہدہ کیا اور ان کے عمدہ نمونے (Sample اور Designs) حاصل کیے۔

سری نگر کی خستہ حالی

مور کرافٹ اور اس کے ساتھیوں نے سری نگر شہر کی ایک ایک عمارت اور ایک ایک گلی کا تفصیلی مشاہدہ کیا، عوامی زندگی کے رنگ ڈھنگ دیکھے، سکھ حکمرانوں کے ٹھاٹھ باٹھ بھی دیکھے اور کشمیری باشندوں کی مفلسی اور کسمپرسی کا مشاہدہ بھی کیا۔ جس سری نگر کی شان و شوکت اور ترقی پر برنیئر رطب اللسان تھا، اس نے جن کشمیریوں کے حُسن اور ذوق کی جی بھر کر تعریف کی تھی، مور کرافٹ کو نہ وہ ترقی یافتہ بلند و بالا عمارات والا صاف ستھرا سری نگر نظر آیا اور نہ وہ خوبصورت، خوش شکل، خوش لباس اور خوش اخلاق کشمیری...... سکھوں کی لوٹ مار اور ظلم و ستم نے سب کچھ تبدیل کر دیا تھا۔ شہر ویرانے بن گئے تھے۔ انسان ہڈیوں کے ڈھانچوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ہر طرف موت کا رقص تھا۔ بھوک اور افلاس کے سائے تھے۔ نشاط اور شالیمار کی بہاریں لٹ چکی تھیں۔ پری محل اور چشمہ شاہی کی رونقیں قصہ ماضی بن چکی تھیں۔ اب کشمیر کی عظمت و شوکت قصہ پارینہ ہو چکی تھیں۔ مور کرافٹ لکھتا ہے :

> ''دروازے ٹوٹے ہوئے یا بالکل ہی غائب.......... جنہیں چیتھڑوں سے ڈھانکا گیا ہے۔ دیواریں ٹوٹی ہوئی اور چھتیں نیچے کو دھنسی ہوئی جیسے ابھی گر پڑیں گی۔ باغات کی حالت زار بھی ان عمارتوں سے قطعی مختلف

نہیں۔ یہ سب کچھ کہنگی، فرسودگی اور بربادی کا منظر پیش کرتا ہے۔''

اس ٹوٹ پھوٹ سے جو چیز بچی ہوئی تھی اور جس نے اسے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ,,دیودار،، کی لکڑی پر نقاشی کا کام تھا جس پر بے رحم موسموں یا کیڑوں مکوڑوں نے کوئی اثر مرتب نہیں کیا تھا۔ یہاں بھی مورکرافٹ کی تجارتی اور لالچی ذہنیت جھلکتی ہے کہ وہ فوراً یہ فیصلہ کرتا ہے کہ دیودار جیسے قیمتی درخت کے بیج حاصل کر کے یورپ میں انہیں بڑے پیمانے پر اگانے کا انتظام کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ سکھ گورنر سے دو محافظ بھی حاصل کرتا ہے۔ اور دیودار کے بیجوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ بیج تلاش کرتے کرتے وہ کشتی کے ذریعے جھیل ولر پہنچ گیا جہاں سے اس نے جھیل میں واقع جزیرے ''لنکا'' میں کچھ دیر قیام کیا۔ وہاں اس نے ایک مُنہدم شدہ مسجد کے آثار دیکھے جو سلطان زین العابدین بڈشاہ نے بنوائی تھی۔ جھیل ولر پر اسے سکاٹ لینڈ یا ویسٹ مورلینڈ کی کسی خوبصورت جھیل کا گمان گزرا۔ جھیل ولر سے نکل کر جب وہ سوپور کی طرف روانہ ہوا تو چیتھڑوں میں ملبوس فلاکت زدہ کشمیریوں کے ایک ہجوم نے اسے گھیر لیا جو اسے امداد کے لیے پکار رہے تھے۔ ان کے چہرے مدقوق اور جسم پر چیتھڑے تھے۔ بھوک نے انہیں اس قدر بدحال کر رکھا تھا کہ ان کی چیخیں ان کے سینوں میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ ان کے بارہ میں مورکرافٹ لکھتا ہے:

''ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ انسان ہیں یا بھٹکی ہوئی روحیں''

اس نے یہاں سے اپنے ہمراہیوں کے ہمراہ سفر جاری رکھا اور خشکی کے راستے چلتے چلتے وہ دیودار کے جنگل پہنچ گیا جہاں سے اس نے اپنے ساتھیوں اور ملازموں کی مدد سے دیودار کے بیج اکٹھے کیے۔ واپسی کا سارا سفر اس نے خشکی کے راستے کیا۔ اسے ہر طرف تباہی و بربادی، بھوک، افلاس اور ظلم و بربریت کے سائے رقصاں نظر آئے۔ وہ ایسے گاؤں سے گزرا جہاں سکھ سپاہی کسانوں سے ٹیکس وصول کر رہے تھے۔ وہ فصلوں کا

9/10 حصہ ٹیکس کے طور پر وصول کرتے اور باقی ماندہ 1/10 رشوت میں کاٹ لیتے۔ بیچارے غریب کسان کے پاس مُٹھی بھر غلہ بھی نہ بچتا اور وہ اس کا گھرانا فاقوں کا شکار رہتا .... سکھ حکمران ریاست کا سارا غلہ سمیٹ کر لے جاتے اور ریاست کے باشندوں کے لیے بھوک اور ننگ چھوڑ جاتے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر مورکرافٹ کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر ریاستی ظلم و جبر کا یہی حال رہا تو جلد ہی دنیا کی یہ خوبصورت ترین وادی بھوک، قحط اور ہجرت کے باعث انسانی آبادی سے محروم ہو جائے گی۔

مورکرافٹ نے سری نگر سے باہر دوسرا سفر دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ اسلام آباد (انت ناگ) کا کیا۔ یہ سفر نسبتاً خوشگوار تھا۔ دوران سفر اس نے پانپور میں زعفران کے کھیت بھی دیکھے جن کے شگوفے ابھی نہیں پھوٹے تھے۔ اس نے اونتی پورہ میں ہندوؤں کے ایک مندر کے کھنڈرات بھی دیکھے اور بیج بہاڑہ میں داراشکوہ کے باغ کے آثار کا بھی مشاہدہ کیا جس پر اب ویرانی نے ڈیرے جما رکھے تھے۔

سری نگر کے بعد اسلام آباد انت ناگ شال بافی، کشیدہ کاری اور قالین بافی کا دوسرا بڑا مرکز تھا۔ مورکرافٹ خود لکھتا ہے کہ اس وقت اسلام آباد میں تین سو سے زیادہ شال باف تھے۔ اگرچہ اسلام آباد ایک بوسیدہ عمارات کا شہر تھا جو گندگی اور کیچڑ سے بھرا ہوا اور نیم جان انسانی ڈھانچوں سے آباد تھا۔ اس شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے گزر کر وہ ویری ناگ کی جانب عازم سفر ہوا جو دریائے جہلم کا منبع ہونے کے علاوہ مغلیہ دور کے شہنشاہ جہانگیر کی محبوبہ نور جہاں کی توجہ کا مرکز بھی رہا ہے۔ جہاں اس نے اپنی ملکہ کے لیے ایک خوبصورت باغ لگوایا تھا اور ایک تالاب بھی بنوایا تھا۔ جس میں رنگ برنگی مچھلیاں چھوڑی گئی تھیں۔ یہ مچھلیاں برنیئر کے سفر کشمیر تک موجود تھیں اور اس نے ان کا ذکر بھی اپنے سفرنامے میں کیا تھا۔ برنیئر کے ڈیڑھ سو سال کے بعد جب مورکرافٹ یہاں پہنچا تو نہ وہ باغ تھا

جہاں کبھی جہانگیر اور اس کی محبوب ملکہ نور جہاں محو گلگشت رہتے تھے، نہ وہ تالاب تھا اور نہ وہ مچھلیاں تھیں جن کی گردن میں نور جہاں کا ڈالا ہوا حلقہ ساز دلبری برنیئر کو بھی نظر آ گیا تھا۔ اب یہ سب کچھ صفحہ ہستی سے محو ہو کر ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکا تھا۔ یہاں سے مورکرافٹ مارتنڈ کی پہاڑی چوٹی پر واقع ہندوؤں کے قدیم اور تاریخی مندر کی سیر کو گیا۔ نحوست کے سائے یہاں بھی لرزاں تھے۔ یہ مندر بھی حکمرانوں کی قدر ناشناسی اور حالات کی بے رحمی پر ماتم کناں تھا۔ اس کی حالت بھی دوسرے تاریخی مقامات سے مختلف نہ تھی۔ برنیئر کی طرح مورکرافٹ بھی امرناتھ کا مشہور عالم غار دیکھنے کا متمنی تھا۔ اس نے کسی سے سنا تھا کہ غار میں بیٹھا شخص تبت میں بھونکتے ہوئے کتے کی آواز سن سکتا ہے اگرچہ یہ سوال اپنی جگہ پر غور طلب ہے کہ اس بات کا فیصلہ کیسے ہو کہ کتے بھونکنے کی آواز واقعی تبت سے آ رہی ہے یا قریبی جنگل سے۔ نامعلوم وجوہ کی بناء پر وہ بھی برنیئر کی طرح واپس سری نگر آ گیا۔

راستے میں اس نے پانڈریتھن کے مقام پر ہندوؤں کا وہ مندر بھی دیکھا جو پانی کی جھیل کے وسط میں بنایا گیا تھا۔ بعد میں تو مندر تک پہنچنے کے لیے پل بنایا گیا لیکن اس وقت پانی میں تیر کر اس تک پہنچنا پڑتا تھا۔ مورکرافٹ کا ہندو دوست ''تیری بک'' تیر کر مندر میں جا پہنچا۔ مورکرافٹ کے خیال میں عبادت کا یہ انداز نہایت تکلیف دہ اور بے فائدہ تھا۔ مندر میں عبادت کے لیے تراشیدہ پتھر کا بنا ہوا کنول کا ایک پھول رکھا گیا تھا۔ مورکرافٹ کے ستر سال بعد ایک پرعزم اور باہمت خاتون سیاح ماریون ڈوھٹی اس جھیل میں تیر کر کنول کے مندر تک پہنچی۔ ماریون ڈوھٹی اور مورکرافٹ کے مشاہدات میں بھی اتنا ہی فرق ہے جتنا ان دونوں کے مقاصد سفر میں، مورکرافٹ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک افسر ہے اور کشمیر کی شال بافی، قالین بافی اور دوسری صنعتوں کو برطانیہ منتقل کر کے اور دیودار کے جنگلات

برطانیہ میں اگا کر اپنے ملک کو مزید دولت مند بنانے کا متمنی ہے۔ جبکہ ڈوھٹی محض ایک مہم جو سیاح ہے جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر حُسنِ فطرت کے شاہکار وادی کشمیر کے نظاروں سے اپنے قلب و روح کو معطر اور منور کرنے آئی ہے۔

مظفر آباد کی سرحد تک

اب مور کرافٹ کشمیر سے واپسی کے لیے بیتاب تھا۔ جولائی میں اس کا کشتیوں کا ایک بھاری بھرکم قافلہ دریائے جہلم کے راستے سری نگر سے بارہ مولا کی جانب روانہ ہوا۔ اس قافلے میں انگریز، ہندو، مسلمان، سکھ، کشمیری ایرانی، ترکستانی، اور بے شمار قومیتوں اور نسلوں کے لوگ شامل تھے۔ بارہ مولا سے جب یہ قافلہ مظفر آباد کی حدود میں داخل ہونے لگا تو مظفر آباد کا مقامی حکمران جو سری نگر کے سکھ گورنر سے زیادہ طاقتور تھا، کے سپاہیوں نے اسے روک لیا اور اس سے پندرہ ہزار روپے ٹیکس طلب کیا جبکہ مور کرافٹ پانچ سو سے زیادہ دینے پر تیار نہ تھا۔ اتنی کم رقم مظفر آباد کے حکام کو منظور نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے مور کرافٹ کے قافلے کو اپنی حدود سے گزرنے کی اجازت نہ دی اور ناچار اسے واپس لوٹنا پڑا۔

مظفر آباد کی سرحد سے وہ اپنے بھاری بھرکم قافلے کے ہمراہ واپس سری نگر پہنچا اور ایک ماہ بعد ستمبر 1823ء میں وہ مغلیہ دور کی تعمیر کردہ سڑک براستہ بہرام گلہ پونچھ، کشمیر سے واپسی کے لیے عازمِ سفر ہوا۔ اگر وہ اب بھی نہ روانہ ہوتا تو اسے مزید ایک سال موزوں موسم کا انتظار کرنا پڑتا لہذا اس نے ریاست سے نکلنے میں ہی عافیت سمجھی۔ مغل بادشاہ جہانگیر نے یہ راستہ شاہی قافلے کے کشمیر آنے جانے کے لیے بنوایا تھا۔ دھوپ سے بچنے کے لیے اس کے کناروں پر دورویہ گھنے سایہ دار درخت لگوائے تھے اور ستانے اور آرام کرنے کے لیے مناسب فاصلے پر سرائے بھی بنوائی تھیں۔ اب درخت کٹ چکے تھے، سرائے کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اور سڑک ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ راستے میں

اس نے حدِ نظر تک پھیلے ہوئے دھان اور گندم کے کھیت دیکھے جن میں فصلیں پک چکی تھیں۔ لیکن ان کی کٹائی نہیں کی جا رہی تھی۔ اس نے فصلوں کی کٹائی نہ ہونے کی وجہ دریافت کی تو اسے بتایا گیا کہ فصل کی کٹائی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خصوصی اجازت سے ہی ممکن ہے اور اجازت اس وقت تک نہیں ملے گی جب تک سرکار کے گوداموں میں موجود گزشتہ سال کا غلہ مہنگے داموں فروخت نہیں ہو جاتا۔ گزشتہ سال کا غلہ جمع کرنے کے لیے سکھ اہلکاروں نے جو طریق واردات اختیار کیا تھا اس کی ایک جھلک آپ گزشتہ سطور میں پڑھ چکے ہیں۔ یہ تھا سکھ حکمرانوں کا اندازِ حکمرانی!

یہی اندازِ حکمرانی ان کے جانشین ڈوگروں نے بھی اپنایا اور تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ایوانِ اقتدار پر ہمیشہ چہرے ہی بدلتے رہے ہیں، حکمرانی کے رنگ ڈھنگ ہمیشہ ایک جیسے رہے ہیں۔ اسی وجہ سے ڈوگروں کے دور میں 1877ء میں ریاست اپنی تاریخ کے بدترین قحط سے دوچار ہوئی اس سال بھی اسی طرح فصل تیار تھی اور کٹائی کے لیے حکومت کی اجازت کی منتظر! لیکن حکومت کے گوداموں میں ابھی پچھلے سال کی لوٹ مار کے غلے کے انبار لگے تھے جو بکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ شاہی فرمان جاری ہونے سے پہلے ہی احکم الحاکمین کی عدالت سے ایک فرمان جاری ہو گیا۔ اس زور کی ژالہ باری ہوئی کہ ریاست بھر کی تمام تیار اور کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں۔ خوراک کا وہ شدید قحط پڑا کہ لوگ ریاست سے ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ اگر حکومت کا ایک اور ظالمانہ قانون آڑے نہ آ جاتا تو ریاست کی ساری آبادی ہجرت کر جاتی لیکن حکومت نے اجازت کے بغیر اس بدقسمت ریاست کے بدقسمت باشندوں پر ریاست سے باہر نکلنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اس وقت بھی ایسی ہی پابندی تھی۔ پانچ سو افراد کا ایک قافلہ مورکرافٹ کے پاس یہ درخواست لے کے آیا کہ وہ انہیں اپنی پناہ میں ریاست سے فرار میں مدد دے۔ سرحدی چیک پوسٹ پر سکھ

محافظوں نے انہیں روک لیا لیکن مورکرافٹ کی مداخلت سے انہیں بھوک اور افلاس کے اس جہنم سے فرار میں کامیابی حاصل ہو سکی۔

کشمیر سے واپسی پر مورکرافٹ اپنے ساتھیوں Trebeck اور گاتھری Guthrie کے ہمراہ براستہ پشاور، کابل بخارا کے لیے روانہ ہوا۔ اپنے بھاری بھرکم قافلے اور سامان سفر کے باعث اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کشمیر سے حاصل کردہ بھیڑوں، پودوں، قالینوں اور دوسری نادر و نایاب اشیاء کے سینکڑوں نمونے ان کے پاس تھے اور ساز و سامان سے لدا پھندا یہ قافلہ انتہائی سست رفتاری سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔ رہزنوں کا خوف اسے قدم قدم پر دامن گیر تھا۔ کشمیر سے حاصل کردہ مختلف اشیاء کے نمونوں کے علاوہ اس نے تجارت کی غرض سے برطانوی مصنوعات کا ایک بڑا ذخیرہ بھی ساتھ رکھا ہوا تھا۔ دریں اثناء یہ افواہ پھیل گئی یہ ان کے پاس سونے چاندی اور ہیرے جوہرات کا قیمتی ذخیرہ بھی ہے۔ اس افواہ نے وسط ایشیاء تک ان کے لیے مشکلات کے کانٹے بچھائے اور آئے روز وہ کسی نئی مصیبت سے دوچار ہوتے رہے۔

اٹھارہ ماہ کے طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد مورکرافٹ کا قافلہ بخارا جا پہنچا۔ بخارا پہنچتے پہنچتے اس کا قافلہ لٹ پٹ کر اپنی تعداد اور حجم دونوں کے اعتبار سے بہت مختصر ہو چکا تھا۔ پانچ ماہ اس نے بخارا میں گزارے۔ واپسی سے عین پہلے اس کے دل میں ایک خواہش نے انگڑائی لی اور یہی خواہش اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ وہ اس خطرناک اور پرپیچ راستے پر جانا چاہتا تھا جہاں اس کے خیال میں ایشیاء کے سب سے قیمتی گھوڑے پائے جاتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں اس نے تنہا اس مہم جوئی کا بیڑا اٹھایا۔ تری بک اور گاتھیری بخارا میں ہی اس کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن مورکرافٹ واپس نہ آیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ راستے میں کہیں قتل ہو گیا تھا اور بعض کی رائے ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر اس اجنبی

راہ پر چل نکلا تو کچھ عرصہ بعد شدید بخار میں مبتلا ہو کر ,,اندھی کھوئی،، نامی ایک جگہ پر وفات پا گیا تھا۔ جو شخص دنیا بھر کی دولت اور ذرائع پیداوار سمیٹ کر اپنے ملک کو مزید خوشحال بنانا چاہتا تھا۔ خود کسمپرسی اور غریب الوطنی کی موت مرا............ ''فاعتبروا یا اولی الابصار''۔

یہ اس کہانی کے المناک انجام کا آغاز تھا۔ مور کرافٹ کی موت کے کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر گاتھیری بھی بیمار ہو کر راہی ملک عدم ہو گیا۔ Terbeck نے اپنے اس دوست کو بخارا کی شہر پناہ کے باہر دفن کیا اور مٹی کا ایک احاطہ اس کی قبر کے ارد گرد بنا دیا کہ کوئی اسے مسلمان کی قبر نہ سمجھ لے۔ شاید دنیا میں کسی ہندو کی یہ واحد قبر ہے۔ اب کم سن Trebeck تنہا اور خوفزدہ تھا اپنے دونوں دوستوں کی جدائی کے بعد اس نے واپسی کا قصد کیا اور افتاں وخیزاں وہ واپسی پر مزار شریف (موجودہ افغانستان) پہنچ پایا تھا جہاں وہ بھی بیمار ہو کر جہاں فانی سے کوچ کر گیا۔ اس کی وفات کے بعد مقامی لوگوں نے اس کا اسبابِ سفر لوٹ لیا۔ مور کرافٹ کی ڈائری کے اوراق بمشکل بچ پائے جو کسی طرح برطانیہ پہنچے اور اس کی وفات کے سولہ سال بعد 1814ء میں برطانیہ سے شائع ہوئے۔

۱۲

ایک عاشق نامراد

ژاک مونٹ

ولیم مور کرافٹ کی مہم جوئی کے اس افسوسناک انجام کے بعد جس یورپی باشندے نے کشمیر کی سیاحت کے لیے وادی گلپوش میں قدم رکھا ایک خوبرو فرانسیسی نوجوان وکڑ ژاک ماؤنٹ تھا۔ ژاک مونٹ پیرس میں میڈیکل کا طالب علم تھا۔ دوران طالب علمی میں وہ ایک اطالوی حسینہ پر عاشق ہو گیا۔ اطالوی حسینہ جو کہ موسیقارہ بھی تھی، نے ژاک مونٹ کی محبت کا جواب محبت سے نہیں بلکہ لاتعلقی، سرد مہری اور بالاخر مکمل انکار سے دیا جس کے باعث ژاک مونٹ اس قدر دلبرداشتہ ہو گیا کہ اپنی زندگی ہی سے مایوس ہو گیا اور نوبت دیوانگی تک آ پہنچی۔ تجربہ عشق کی ناکامی کے نتیجہ میں اس نوجوان عاشق نامراد کی یہ حالت دیکھ کر اس کے والدین نے اسے دور دراز کے ملکوں کی سیر و سیاحت پر آمادہ کیا تا کہ وہ اس قاتل حسینہ کی یادوں سے چھٹکارہ حاصل کر کے معمول کی زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے۔

باغ نباتات میں

اس مقصد کے لیے وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سیر و سیاحت پر نکل گیا جہاں نیویارک میں اس کی اپنے ایک فرانسیسی ہم وطن سے لڑائی ہوگئی۔ اس کے نتیجہ میں اسے امریکہ چھوڑنے کا حکم ملا۔ یوں اسے تجربہ عشق کے بعد تجربہ سیاحت میں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکہ چھوڑنے کے بعد وہ ویسٹ انڈیز چلا گیا جہاں اس کا بھائی گنے کا کاشتکار تھا۔ وہ کچھ عرصہ اپنے بھائی کے ہاں قیام پذیر رہا۔ وہیں اسے اپنے والد کی طرف سے اطلاع ملی کہ پیرس میں مشہور زمانہ باغ نباتات **Botanical Garden** کو مختلف پودہ جات کے نمونے برصغیر ہند سے تلاش کر کے لانے کے لیے ایک ایسے فرد کی ضرورت ہے جو انگریزی بھی بول سکتا ہو اور برصغیر خصوصاً کشمیر میں گھوم پھر کر مطلوبہ پودہ جات کے نمونے حاصل کر سکے۔

ژاک مونٹ نے اس ملازمت پر قسمت آزمائی کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ وہ ویسٹ انڈیز سے واپس پیرس آ کر باغ نباتات کے حکام کے سامنے بغرض انٹرویو پیش ہوگیا۔ خوش لباس اور چرب زبان تو وہ تھا ہی۔ امریکہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ بھلی بری انگریزی بھی بولنے کے قابل ہوگیا تھا۔ لہٰذا اسے ملازمت آسانی سے مل گئی اور اب وہ سفر ہند کے لیے تیار تھا۔

سیدھے ہندوستان روانگی کے بجائے اس نے پہلے انگلستان جا کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام سے ہندوستان کے مختلف صوبوں کے حکمران کے لیے تعارفی خط حاصل کرنے کا پروگرام بنایا تا کہ اسے اس دیار غیر میں انگریز حکام اور مقامی راجاؤں کا تعاون اور سرپرستی حاصل ہو سکے۔ اس وقت تک ہندوستان کے بیشتر حصے پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اسے کمپنی کے حکام، مختلف صوبوں کے گورنروں اور ریاست کے والیوں کے نام تعارفی خطوط مل گئے۔

رنجیت سنگھ سے راہ و رسم

کمپنی کے ڈائریکٹر سے خطوط لے کر جب وہ ہندوستان پہنچا تو وہ گویا یہاں تعینات کمپنی کے حکام کے لیے ایک شاہی مہمان کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔حتیٰ کہ ہندوستان کے گورنر جنرل ولیم بیٹنک Villiam Bentinck جیسی شخصیت سے بھی اس نے دوستی گانٹھ لی۔ یہ دوستی اس کے لیے بڑی معاون ثابت ہوئی۔اس وقت کے پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ کی ملازمت میں بھی بہت سے یورپی افسران تھے۔انہی میں سے ایک جنرل الرڈ (Allard) بھی تھا جو رنجیت سنگھ کی فوج میں بطور جنرل کام کر رہا تھا۔ یہ وہی جنرل الرڈ تھا جس نے سید احمد شہید کی تحریک جہاد کے دوران سکھوں کی فوجی حکمت عملی تشکیل دی تھی اور پشاور اور بالاکوٹ میں تحریک جہاد کیخلاف فیصلہ کن معرکوں میں سکھ فوج کی قیادت بھی کی تھی۔اس جنرل کو جب علم ہوا کہ اس کا ایک فرانسیسی ہم وطن ژاک مونٹ ہندوستان کی سیاحت پر آیا ہوا ہے تو اس نے اسے خط لکھا کہ اگر اس کے لائق کوئی خدمت ہو تو اسے انجام دے کر اسے خوشی ہوگی۔ یہ خط ملتے ہی ژاک مونٹ کو خیال آیا کہ کشمیر جو اس کے سفر کی اصل منزل ہے وہ سکھوں کے کنٹرول میں ہے اور جنرل الرڈ کشمیر کی سیاحت کے حوالے سے بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہے ۔مزید برآں اس کے پاس گورنر جنرل ولیم بیٹنک کا تعارفی خط بھی تھا جس نے اس کا تعارف لارڈ ڈاکٹر وکٹر ژاک مونٹ کی حیثیت سے کرایا تھا، حالانکہ وہ بے چارہ لارڈ تھا نہ ڈاکٹر، بلکہ ایک عاشق نامراد تھا۔ جنرل الرڈ سے ملنے وہ لاہور روانہ ہوا۔لاہور میں جنرل کی وساطت سے پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ کے دربار تک اس کی رسائی ہوگئی۔اب کیا تھا، رنجیت سنگھ اس گورے چٹے، گھنگریالے اور سنہری بالوں والے خوبصورت انگریز نوجوان کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو گیا۔ژاک مونٹ نے رنجیت سنگھ کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس کے مطابق وہ ایک ناقابل بیان عادت کا شکار تھا جسے اس نے ہاضمے کی خرابی کا نام دے رکھا

تھا۔ جبکہ ژاک مونٹ کہتا ہے کہ جب پنجاب کا طاقتور ترین بادشاہ معدے کی خرابی کا ذکر کرے اور مجھے اس کے علاج کے لیے کہے تو میرے لیے یہ سمجھنا چنداں مشکل نہیں کہ اس ,,معدے کی خرابی،، کا کیا مطلب ہے۔ بہر حال یہ رنجیت سنگھ کی کمزوری تھی یا ژاک مونٹ کی خوش قسمتی کہ رنجیت سنگھ جیسا حکمران اس پر اس قدر مہربان ہو گیا۔ یہ مہر ومحبت کا طرزِ عمل یکطرفہ طور پر رنجیت سنگھ کی طرف سے ہی نہیں تھا۔ ژاک مونٹ بھی اسے اگر چہ ایک بے حیا اور بدتمیز شخص قرار دیتا ہے تاہم اسے پسندیدگی کی نظر سے بھی دیکھتا ہے اور رنجیت سنگھ بھی کہتا ہے ,,اب تک میں جتنے یورپی لوگوں سے مل چکا ہوں میرے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ یہی شخص ہے۔ گویا ''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی'' والی کیفیت تھی۔

کشمیر روانگی کے انتظامات

اس پر بس نہیں بلکہ رنجیت سنگھ نے اسی جنرل الرڈ کو، جس نے ژاک مونٹ کو اس سے متعارف کروایا تھا، اس کے سفر کشمیر کے انتظام وانصرام کا مکمل بندوبست کرنے کا حکم بھی دے دیا۔ یوں ایک سرکاری پروٹوکول کے ساتھ ژاک مونٹ کے سفر کشمیر کی تیاریاں ہونے لگیں۔ رنجیت سنگھ نے اسے تحفے تحائف سے بھی جی بھر کر نوازا اور اس کنگلے کھلنڈرے نوجوان کو بیش بہا نقد رقم بھی دے دی تا کہ وہ جی بھر کر عیاشی کر سکے اور جب کشمیر سے واپس آئے تو اس کی ''صحت'' اور بھی اچھی ہو چکی ہو۔

مارچ 1831ء میں جیکمونٹ ایک نرالی شان وشوکت سے لاہور سے کشمیر کے سفر پر روانہ ہوا۔ اس کے قافلے میں اونٹ اور گھوڑے اس کی سواری کے لیے، قلی اس کا ساز و سامان اٹھانے کے لیے، شاہی محافظ اس کی حفاظت کے لیے ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ ذاتی خدمت کے لیے ملازمین، پرائیویٹ سیکرٹری اور دوسرا عملہ بھی اسے فراہم کر دیا گیا تھا۔ وہ ہر قسم کی فکر و پریشانی سے بے نیاز ہو کر سیاحت کا لطف اٹھانے، اپنا تحقیقی کام پایہ

تکمیل تک پہنچانے، پودوں کے نمونے حاصل کرنے، تصاویر بنانے، نوٹ لکھنے اور چٹانوں اور زمین کی ساخت کا معائنہ کرنے کے قابل ہو سکے۔

ژاک مونٹ کا یہ قافلہ جب کشمیر کی حدود کے قریب پہنچا تو کچھ رہزنوں نے کسی تنگ اور دشوار گزار گھاٹی میں اس کا راستہ روک لیا اور خنجر کی نوک پر اس سے پانچ سو روپے طلب کیے۔ بصورت دیگر اس قافلے کو لوٹ لینے کی دھمکی دی۔ اس موقع پر ژاک مونٹ کی حاضر جوابی اور چابک دستی سے قافلہ مکمل طور پر لٹنے سے تو بچ گیا تاہم اس کا کچھ اسباب چرا لیا گیا۔ اپنے باپ کے نام ایک خط میں وہ اس دشوار گزار اور تنگ پہاڑی راستے کا ذکر کرتے ہوئے طنزاً لکھتا ہے:

''ہندوستانی اور ایرانی کشمیر کو جنت ارضی قرار دیتے ہیں۔ یہ بات اس لحاظ سے درست ہے کہ اس تک پہنچنے والا راستہ نہایت کٹھن، تنگ اور دشوار گزار ہے۔''

سری نگر پہنچنے پر سفر کے اس ناخوشگوار واقعہ کی یادوں کی تلخی میں کچھ کمی آئی ہے۔ چنانچہ سری نگر پہنچتے ہی وہ اپنی والدہ کو جو خط لکھتا ہے اس میں قیمتی تحائف اور خاطر مدارت پر رنجیت سنگھ کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اسے یقین دلایا گیا ہے کہ اس کی مسروقہ اشیاء اسے بازیاب کرادی جائیں گی۔

سری نگر میں اسے بھی مورکرافٹ کی طرح دلاور خان کے باغ میں ٹھہرایا گیا۔ یہ جگہ اسے ہر لحاظ سے پسند آئی۔ البتہ اسے صرف ایک شکایت ہے کہ یہاں اسے تنہائی Privacy میسر نہیں۔ شاید رنجیت سنگھ والی ''شاہانہ عادت'' اس کے ریاستی حکام کو بھی لاحق ہوئی ہو اور اسی وجہ سے بار بار اس کی Privacy متاثر ہوتی رہی ہو۔ واللہ اعلم!

قصاب صفت گورنر

رنجیت سنگھ کے اس سارے لطف و کرم کے باوجود کشمیر میں اس کے قصاب صفت سکھ گورنر کے معصوم کشمیریوں پر مظالم نے اس کا دل خون کے آنسو رلایا۔

وہ لکھتا ہے کہ ریاستی گورنر نے اسے بتایا کہ اس نے اپنی گورنری کے صرف پہلے سال میں دوسو کشمیریوں کو محض اس لیے قتل کر دیا کہ وہ کشمیریوں پر اپنے اقتدار واختیار اور ظلم وجبر کی دھاک بٹھانا چاہتا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ ژاک مونٹ پر اس قدر مہربان ہو چکا تھا کہ پانچ ماہ بعد سفر کشمیر سے واپسی پر جب وہ دوبارہ سکھ دربار لاہور میں رنجیت سنگھ سے ملنے گیا تو رنجیت سنگھ نے بقول ژاک مونٹ کے اسے کشمیر کا گورنر بننے کی پیش کش کی۔ اس نے ہنس کر شکریہ کے ساتھ اس پیش کش کو قبول کرنے سے معذرت کر لی۔

صاحب لوگوں کے اطوار

برطانوی ہند سے ''آزاد علاقوں'' یعنی پنجاب اور کشمیر آنے سے پہلے ژاک مونٹ نے برطانیہ کے زیر انتظام ہندوستانی صوبوں میں گھوم پھر کر لوگوں کی بود باش اور برطانوی حکمرانوں اور افسروں کے انداز حکمرانی کا جائزہ لیا تھا۔ وہ ہندوستان میں تعینات انگریز افسروں کو کاہل اور سست قرار دیتا ہے جو دن بھر شراب پیتے اور ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھ کر گپیں ہانکتے رہتے ہیں۔ انہیں عوام کی فلاح و بہبود، اچھے نظام حکومت کے قیام اور برطانوی اقتدار کے استحکام سے کوئی غرض نہیں۔ اور وہ انگریز خواتین کو بھی ہدف تنقید بناتا ہے جو اپنا وقت فضول گپ شپ یا فیشن سے متعلق غیر معیاری اخبارات ورسائل پڑھنے میں صرف کرتی ہیں وہ دعا کرتا ہے کہ خدا اسے کسی برطانوی بیوی کا شوہر ہونے سے بچائے۔

وہ برطانوی ہند سے جوں ہی سکھوں کے زیر انتظام علاقوں میں قدم رکھتا ہے، سکھوں کے مظالم، لوٹ مار اور بدانتظامی دیکھ کر اسے برطانوی اقتدار خدا کی ایک نعمت معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگرچہ اس نے برطانوی اندازِ حکمرانی پر تنقید کی ہے اور اب بھی وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی اصلاح کی شدید ضرورت ہے تاہم باقی ہندوستان کے مقابلے

میں برطانوی اقتدار ایک نعمت سے کم نہیں اور اس کی سوچی سمجھی رائے ہے کہ جتنا ممکن ہو سکے، پنجاب اور کشمیر پر برطانوی اقتدار قائم ہونا ضروری ہے۔

لالہ رخ کے کشمیر سے لالہ رنجیت کے کشمیر تک

ژاک مونٹ اپنے ہمراہ مغرب میں کشمیر کے بارے میں چھپنے والی ایک شہرہ آفاق رومانوی نظم ,, لالہ رخ ،، بھی ہمراہ لایا تھا تا کہ وہ کشمیر میں بیٹھ کر اس کے مطالعہ سے لطف اندوز ہو سکے لیکن کشمیر میں تو اسے وحشت اور بربریت کا رقص ہر کہیں نظر آیا۔ کشمیر کی وہ ماضی کی خوبصورتی، باغوں کی بہاریں، آبشاروں کی روانی، بہاروں کی جوانی، پھولوں کی مہک، سبزے کی لہک، کئی کئی منزلہ عمارتیں اور اس وادی رنگ نور کے باسیوں کا وہ رومان پرور حُسن نظر اور حُسن ذوق ....یہ سب کچھ اب قصہ ماضی بن چکا تھا.........لہذا ژاک مونٹ کو ,, لالہ رنجیت سنگھ ،، کے کشمیر میں لالہ رخ کے کشمیر سے کوئی مشابہت نظر نہ آئی۔ یہ وجہ ہے کہ اسے کشمیر میں اس کتاب کے مطالعہ میں کچھ مزہ نہ آیا اور اسے ''لالہ رخ'' اور اس کے مصنف تھامس مور سے نفرت سی ہو گئی۔ ایسی تباہ حال وادی سے ''لالہ رخ،، جیسی شاہکار رومانوی نظم کا منسوب ہونا اسے بہت مضحکہ خیز لگا اور اس نے تھامس مور کو بے نقط سنائیں۔ اس لٹے پٹے کشمیر کو دیکھ کر وہ یہ رائے قائم کرنے میں بڑی حد تک حق بجانب بھی تھا لیکن کاش اس نے بڈشاہ اور شہاب الدین کا کشمیر دیکھا ہوتا، اس نے داراشکوہ کی کشمیر کے ساتھ محبت کا مشاہدہ کیا ہوتا۔ اس نے نور جہاں اور جہانگیر کی محبت کے انمٹ نقوش اس وادی لالہ گل میں جا بجا بکھرے دیکھے ہوتے۔ ویری ناگ کے چشمے میں مچھلیوں کو دیکھا ہوتا جن کے گلے میں نور جہاں نے سونے کے ہار پہنا رکھے تھے۔ پری محل اور نشاط و شالیمار کا عہد بہاریں دیکھا ہوتا، کاش اس نے کشمیر کو برنیئر کی آنکھ سے دیکھا ہوتا!

جواں مرگ کی آخری سالگرہ

اپنی قیام گاہ دلاور خان کے باغ سے نکل کر وہ وادی میں گھومتا پھرتا، جانوروں اور چٹانوں کے نمونے سمیٹتا اور مختلف مناظر کا مشاہدہ کرتا ہوا شام کو واپس اپنی قیام گاہ پر آجاتا۔ 1831ء کا موسم گرما غیر معمولی طور پر زیادہ گرم گزرا۔ ایسے میں گرمی کی شدت سے تنگ آکر وہ جھیل ڈل کی سیر کو نکل جاتا۔ ڈل کے کنارے ہری پربت کے دامن میں مغلیہ عہد کا نسیم باغ ایک ویرانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ نسیم باغ کے پہلو میں اس نے جھیل ڈل میں غسل کیا اور یہیں اس نے اپنی تیسویں سالگرہ منائی۔ اس موقع پر اسے اپنے والدین اور بہن بھائی بہت یاد آئے۔ اپنے گھر اس نے جو خط لکھا اس میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ محبت اس کی سطر سطر سے جھلکتی ہے۔ اپنے وطن اور عزیز واقارب کی یاد اسے رہ رہ کر ستاتی ہے۔ وہ والدین کے نام خط میں لکھتا ہے کہ وہ کافی کمزور ہو گیا ہے۔ دہلی میں اس نے ایک آئینہ خریدا تھا، وہ بار بار آئینہ میں اپنی شکل دیکھتا ہے اور اپنے دبلے ہو جانے پر تشویش کا اظہار کرتا ہے، اس کے اس دبلے ہونے پر شاید اس سے زیادہ تشویش مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ہوئی ہوگی!

اس کی اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ اس کی خط و کتابت بڑی باقاعدگی سے جاری رہی۔ لاہور سے جنرل الرڈ نے اس کی ڈاک اس تک پہنچانے کے لیے خصوصی ہرکاروں کا انتظام کر رکھا تھا اس لیے اس کو اپنے اہل خانہ کی طرف سے اپنے خط کا جواب بھی بغیر کسی تاخیر کے مل جاتا تھا۔ لہٰذا اس کا اہل خانہ کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ بدستور قائم رہا اور نسیم باغ کے ایک گوشے میں جھیل ڈل کے کنارے اس نے اپنی سالگرہ منائی تو اسے کیا علم تھا کہ اس جواں مرگ کی یہ آخری سالگرہ ہوگی!

حضرت بل میں

نسیم باغ کی سیر کے بعد وہ جھیل ڈل میں واقع ایک جزیرے ''چار چنار'' بھی گیا۔ مغلیہ دور میں یہ جزیرہ ایک خوبصورت تفریحی مقام تھا۔ جس کے چاروں کناروں پر چنار کے درخت لگائے گئے تھے اسی وجہ سے اس کا نام ''چار چنار'' پڑ گیا۔ ژاک مونٹ جب وہاں گیا تو وہاں صرف دو درخت باقی تھے۔ یہاں اس نے اس جھیل ڈل کی نیلگوں سطح آب کا نظارہ کیا۔ جس کے پس منظر میں حضرت بل کے مینار ایک عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ ژاک مونٹ نے حضرت بل میں رکھے گئے حضورﷺ کے موئے مبارک کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جو عالمگیری عہد میں یہاں لا کر رکھا گیا تھا اور تب سے اب تک وہیں موجود ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانان کشمیر کو حضرت بل سے ایک خاص عقیدت ہے۔

واپسی

ستمبر 1831ء میں وہ درجنوں صندوقوں، بنڈلوں اور دوسرے ساز و سامان کے ساتھ کشمیر سے روانہ ہوا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ پودوں، جانوروں، مٹی اور چٹانوں کے نمونہ جات اور مچھلیوں کی اقسام اور شالوں سے بھرے ہوئے صندوق لے کر سورت (بمبئی) پہنچے گا اور وہاں سے کسی بحری جہاز کے ذریعے وطن مالوف روانہ جائے گا۔ کشمیر سے واپسی پر وہ امرتسر پہنچا جہاں اس نے رنجیت سنگھ سے ملاقات کی اور اس کے تعاون اور لطف و کرم پر اس کا شکریہ ادا کر کے وہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ دہلی، اجمیر اور جے پور کے شہروں میں اس نے کافی عرصہ قیام کیا۔ اجمیر سے وہ پونا پہنچا جہاں وہ دست کی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ کمزور وہ پہلے ہی ہو چکا تھا، بیماری نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ اگر چہ اس مرحلے پر وہ صحت یاب ہو گیا۔ لیکن بیماری کے اثرات سے مستقل طور پر چھٹکارا نہ ملا۔ یہاں سے اس

کی اگلی منزل بمبئی تھی۔ روانگی سے قبل اسے معلوم ہوا کہ بمبئی میں ہیضے کی وباء پھوٹ پڑی ہے لہذا اس سے مزید پانچ ماہ کے لیے روانگی کا پروگرام موخر کر دیا اور پونا میں ہی اپنے قیام کی مدت بڑھالی۔

مایوسی وافسردگی

اس پیش آمدہ صورت حال سے وہ مایوس اور دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ کہاں وہ وقت کہ جب اس نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ اسے شاہی مہمان کا درجہ حاصل تھا۔ کمپنی کے ڈائریکٹروں کے تعارفی خطوط اور اس کے سفر وحضر کے انتظامات کے لیے گورنروں کے نام حکم نامے اس کے پاس تھے۔ گورنر جنرل ولیم بینٹنگ جنرل الرڈ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ جیسے لوگوں کے ساتھ اس نے یارانہ گانٹھ لیا تھا........ اور کہاں یہ وقت کہ ایک کمزور ونحیف، بیمار ولاغر وافسردہ غریب الوطن ژاک مونٹ پونا میں بے یار ومددگار پڑا تھا۔ اسے پونا میں تعینات اپنے ہم وطن یورپی باشندوں اور حکام کی عدم توجہی اور سرد مہری کی بھی شکایت ہے۔ اور ان کا ذکر بڑی حقارت سے کرتا ہے۔ ایک دوست کے نام اپنے خط میں انگریز افسروں کے بارہ میں لکھتا ہے۔

"They go out for riding and driving. Breakfast, ine, dress, and underess, they have no time to settle the affairs of the public Library where I have seen nobody except myself... and that is their whole life.The stupid creature! The idiots! The judge is a perfect idiot. The magistrate is a rabit hunter..."

ہیوگل سے ملاقات

اس کے انداز تحریر اور الفاظ کے انتخاب سے اس کی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک دن کھانے کی ایک دعوت میں اس کی ملاقات ایک دوسرے مشہور سیاح بیرن چارلس ہیوگل سے ہوگئی۔ چارلس ہیوگل نے بھی بعد میں کشمیر کا سفر کیا۔ جس کا تذکرہ اپنے مقام پر آئے گا۔ چارلس ہیوگل کے بارہ میں بھی اس کے احساسات محولہ بالا خط کے مندرجات سے مختلف نہیں۔ آخر کار ژاک مونٹ پونا سے بمبئی کے لیے روانہ ہوا۔ وہ بہت کمزور ہو چکا تاھ۔ اس کی مایوسی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔ اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ ہندوستان پہنچتے وقت جو شوخی، طنطنہ اور تجسس اس کی طبیعت میں تھا اس کا اب نام و نشان بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب ایک بدلا ہوا ایک مختلف ژاک مونٹ تھا جو بمبئی کے ساحل سے اپنے وطن روانہ ہونا چاہتا تھا۔

وفات

بمبئی پہنچنے کے صرف پانچ دن بعد وکٹر ژاک مونٹ اپنی زندگی کے اکتیسویں سال میں وفات پا گیا۔ اسے فوجی اعزاز کے ساتھ بمبئی میں سپرد خاک کیا گیا۔ ایک فرانسیسی تاجر جیمز نکل James Nichol نے اس کی تدفین کا انتظام و انصرام کیا اور بعد ازاں گیارہ صندوقوں، متعدد بنڈلوں اور ایک بیرل پر مشتمل اس کا سامان بحری جہاز کے ذریعے پیرس روانہ کر دیا گیا۔ اسی برطانوی تاجر نے اس کے والد کو خط لکھ کر اس کی وفات کی اطلاع بھی دی۔ وکٹر ژاک مونٹ نے اپنے پیش رو ولیم مور کرافٹ پر بھی شدید تنقید کی تھی لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھیں کہ انجام دونوں کا ایک جیسا ہوا۔ دونوں دیار غیر میں وطن سے دور کسمپرسی کی موت مرے۔ یہ الگ بات کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے مستقل ملازم ولیم

مورکرافٹ کی قدر افزائی نہ کی بلکہ اس کی تنخواہ تک بند کر دی۔ جبکہ ژاک مونٹ کی خوب آؤ بھگت کی اور اسے شاہی مہمان تک کا درجہ ملا۔ لیکن بالاخر دونوں ایک جیسی موت مرے اور اجنبی زمین میں دفن ہوئے۔

۱۳

چارلس ہیوگل

برنیئر کے بعد جس شخص کی سیاحت کشمیر نے بے پناہ شہرت حاصل کی اور جس کا سفر ایک حوالہ بن گیا وہ آسٹریا کا ایک فطرت پرست سیاح ہیوگل تھا۔ اس کا پیش رو سیاح ژاک مونٹ قبل ازیں پونا میں ایک ضیافت میں اس سے مل چکا تھا اور کشمیر کے حالات کی کچھ تفصیل اسے ژاک مونٹ کی زبانی معلوم ہو چکی تھی۔ بیرن ہیوگل نے مغل روٹ پر 1838ء میں جانب کشمیر سفر اختیار کیا۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک ملازم ہنڈرسن تین ماہ تک لداخ میں قید کاٹنے کے بعد سری نگر پہنچا تھا اور اسی اثناء میں ایک اور فطرت کا پرستار 35 سالہ برطانوی بیرسٹر گارڈ فرے وائینے بھی اپنے ذوق تجسس اور سفر پسند طبیعت کی تسکین کے لیے لداخ سے سیر و سیاحت کرتے ہوئے کشمیر پہنچا تھا۔ 18 نومبر 1838ء کی شام دلاور خان کے باغ میں حسن اتفاق سے یہ مختلف یورپی ملکوں سے تعلق رکھنے والے تینوں سیاح اکٹھے ہو گئے اور آپس میں گھل مل گئے۔

تین سیاحوں کی اتفاقیہ ملاقات

گاڈ فرے وائینے جھیل ڈل میں مرغابی کے شکار پر نکلا ہوا تھا کہ وہیں اسے بیرن ہیو گل کے کشمیر پہنچنے کی خبر ملی۔ وہ واپس دلاور خان کے باغ میں پہنچا تو یک نہ دو شد، ایک کے بجائے دو یورپی باشندوں سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ ان میں سے ایک تو بیرن ہیوگل تھا

جب کہ دوسرا لداخ کے لباس میں ملبوس ایک اجنبی یورپی تھا۔ ہنڈرسن کی ہیوگل سے ملاقات بھی حسن اتفاق تھی۔ ہیوگل دلاور خان کے باغ سری نگر پہنچ کر اپنا سامان ترتیب سے لگانے کے بعد ڈائری میں دن بھر کی روداد قلمبند کر رہا تھا کہ ملازم نے آ کر اطلاع دی۔ ''کوئی مصیبت زدہ قسم کا یورپی باشندہ آپ سے ملاقات کا متمنی ہے۔'' اس نے اندر بلایا تو یہ جان کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ نو وارد ڈاکٹر ہنڈرسن تھا جس کے نام سے اس وقت تک ہندوستان کے بیشتر لوگ واقف ہو چکے تھے۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے غیر معینہ مدت کی رخصت لے کر تبت، لداخ اور دوسرے پہاڑی علاقوں کے خطرناک سفر پر نکلا ہوا تھا۔ اس کا ناک نقشہ ہیوگل نے یوں کھینچا ہے۔

''سرخ و سفید لمبوترا چہرہ، جس پر ناک اور آنکھیں نمایاں تھیں اور سرخی مائل گھنی داڑھی......... یہ اس کے چہرے کے نمایاں خدوخال تھے۔ وہ تبت کے روائتی لیکن میلے کچیلے لباس میں ملبوس تھا، سکاٹ لینڈ کے مستحکم لہجے میں اس نے مجھ سے معذرت کرتے ہوئے گاڈفرے وائینے کا پوچھا۔ میں نے جواباً اس کا تعارف پوچھا تو اس نے بتایا،، آپ نے یقیناً ہنڈرسن کے بارے میں کچھ سن رکھا ہوگا''!

یہ ہنڈرسن عجیب وغریب طبیعت کا حامل شخص تھا۔ سیر و سیاحت سے اسے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا اور سفر بھی مشکل ترین پہاڑوں، جنگلوں، دروں اور گھاٹیوں کا۔ جب بھی وہ کمپنی سے چھٹی لیتا، کچھ عرصے بعد کمپنی کے حکام کو ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے یہ اطلاع ملتی کہ ایک پراسرار برطانوی باشندہ بھیس بدل کر گھومتا پھرتا پایا گیا ہے۔

محبت میں ناکامی

چالیس سالہ خوبصورت اور خوبرو بیرن ہیوگل ایک پراسرار سفر پسند اور مہم جو طبیعت کا حامل شخص تھا۔ ہائیڈل برگ سے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں

بھرتی ہوگیا تھا اور یوں اسے فرانس، اٹلی، سویڈن، اور روس کے سفر کرنے کے مواقع ملے تھے۔ 1824ء میں فوج سے ریٹائر ہوکر اپنے گھر ویانا چلا گیا۔ اس کا ارادہ کھیتی باڑی اور باغبانی کا تھا تا کہ اپنی بقیہ زندگی اپنے اس ذوق کی تسکین میں صرف کر سکے۔ دریں اثناء وہ بھی اپنے پیشرو ژاک مونٹ کی طرح ایک عورت کے عشق میں گرفتار ہوگیا اور بالکل ژاک مونٹ کی طرح اسے عشق میں ناکامی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ سانحہ یہ ہوا کہ اس کی محبوبہ اس وقت کے شہزادے نے چھین لی تھی۔ چونکہ وہ شہزادہ اور ولی عہد سلطنت تھا اور چارلس ہیوگل بیچارہ مجبور و بے بس عاشق تھا۔ اپنی محبت کا افسوس ناک انجام ہیوگل سے برداشت نہ ہوسکا اور وہ اس حادثے کے اثرات ذہن سے محو کرنے اور فطرت کی رنگارنگی اور بوقلمونی کا مشاہدہ کرنے مشرقی ممالک کی سیاحت پر نکل کھڑا ہوا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ یورپ میں جو انقلابِ عظیم رونما ہوا اور جس کے نتیجے میں عوامی بغاوت میں بپھرے ہوئے عوام نے اپنے ظالم حکمرانوں شہزادوں اور ولی عہدوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ یہ ہیوگل ہی تھا جس نے اس کی محبت چھیننے والے شہزادے اور اپنی سابق محبوبہ جو اس وقت ایک شہزادی بن چکی تھی کو بحفاظت وہاں سے نکالا اور انگلینڈ پہنچایا۔ یہ بات اس کے ظرف اور بلند کردار کی عکاسی کرتی ہے کہ اس نے اس وقت اپنے رقیب روسیاہ لیکن مجبور شہزادے کی مدد کی جب اس کی زندگی شدید خطرے میں تھی اور اس کی طرف سے اپنے اوپر روا رکھے جانے والے ظلم کا جواب مہربانی اور کرم سے دیا۔

مشرق کا سفر

محبت میں ناکامی کے بعد 1832ء میں وہ ہندوستان انڈونیشیا، آسٹریلیا، اور مشرق بعید کے دیگر ممالک کے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ ژاک مونٹ سے جب پونا میں اس کی ملاقات ہوئی تھی تو اس وقت وہ سوئے کشمیر نہیں بلکہ جانب مشرق بعید عازم سفر تھا۔ ملکوں

ملکوں پھرنے، گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے اور در در کی خاک چھاننے کے بعد 1835ء میں وہ واپس ہندوستان پہنچا۔ اب اس کے سفر کی اگلی منزل حسن فطرت کا شاہکار وادی کشمیر تھی۔ سفر کشمیر بھی اس نے اپنے ہی انداز میں اختیار کیا۔ اگر چہ اس کی محبوبہ اس کی سلطنت کا شہزادہ اس سے چھین لے گیا تھا پھر بھی اس کا اپنا مزاج اور رنگ ڈھنگ بھی شہزادوں سے کم نہ تھا کہ اس نے ستر ملازمین کا ایک دستہ اپنی خدمت کے لیے ہمراہ رکھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک ملازم صرف اس کا حقہ اٹھانے اور اسے تازہ کر کے حسبِ خواہش اس کے سامنے پیش کرنے پر مامور تھا۔ اسی طرح ایک درزی، ایک خانساماں، دو معاون خانسامے، ایک معاون شکاریات، پودوں اور جانوروں کے نمونہ جات جمع کرنے کے لیے دو مالی غرض تتلیاں پکڑنے کے لیے بھی دو افراد تعینات تھے۔ بارہ آدمی اس کی بھاری بھر کم اور آرام دہ کرسی اٹھانے پر مامور تھے۔ اس کے ہمراہ کتبہ نویس بھی تھے جو ہیوگل کا نام مختلف لوحوں پر لکھ کر حسبِ ضرورت نصب کرتے تھے۔ سفر کشمیر کے دوران اس کا بھاری بھر کم ساز و سامان اٹھانے والے درجنوں مزدور اور قلی اس کے علاوہ تھے جو اکثر ہیوگل کے رویے سے دلبرداشتہ ہو کر ہڑتال پر رہتے اور ہیوگل بار بار کبھی ڈرا دھمکا کر اور کبھی منت سماجت کر کے انہیں کام پر لگاتا رہتا تھا۔ اس سفر میں وہ ہمیں انسانوں کے گڈریے کی شکل میں نظر آتا ہے جو ڈنڈا اٹھائے قلیوں اور مزدوروں کو ہانکتا آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے اس کے ملازمین کبھی آپس میں لڑ پڑتے ہیں اور کبھی وہ متحد ہو کر اس کے خلاف ہڑتال کر دیتے ہیں۔ کبھی وہ اپنے خانسامے کو برطرف کر رہا ہوتا ہے، کبھی وہ اپنے پیغام رسانوں کو اپنے ہاتھوں ڈنڈے رسید کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی وہ لومڑی کی طرح کے ایک جانور کے پیچھے خود بھاگ رہا ہوتا ہے تو کبھی وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر اپنی یاداشتیں قلمبند کرنے میں مصروف ہوتا ہے۔

لومڑی کی تلاش

ایک مرتبہ یوں ہوا کہ جھاڑیوں سے ایک عجیب وغریب شکل کا خوبصورت سا جانور نکل کر دوسری جانب کی جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔ ہیوگل نے اپنے ملازمین کو اس کا پیچھا کرنے بھیجا لیکن کام چور ملازمین نے کچھ ہی دیر بعد آ کر اطلاع دی کہ جانور غائب ہو گیا ہے۔ غصے سے جل بھن کر ہیوگل نے خود ہی اس جانور کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا اور رینگتا ہوا جھاڑیوں میں گھس گیا اس کے ملازموں میں سے کسی نے اس کو جانور سمجھ کر فائر کر دیا۔ خوش قسمت تھا کہ نشانہ چوک گیا ورنہ ہیوگل کو اپنی یہ مہم جوئی مہنگی پڑتی اور لومڑی کا شکار کرتے کرتے وہ اپنے ہی ملازموں کے ہاتھوں شکار ہو چکا ہوتا۔

مقدس چمگادڑ کا شکار

ایک روز بے خیالی میں اس نے بندوق اٹھائی اور ایک چمگادڑ کا نشانہ لیکر گولی چلا دی چمگادڑ بیچارے کی کیا مجال تھی کہ وہ گولی کی تاب لاسکتا۔ مرنا تو اس بے چارے نے تھا ہی تاہم یہ بے ضرر سی مہم جوئی بھی ہیوگل کے لیے وبال جان بن گئی۔ مقامی ہندووں کا ایک جلوس احتجاج کرتے ہوئے اس کی قیام گاہ پر پہنچ گیا اور ''حضرت چمگادڑ'' کے اس قتلِ ناحق پر اس سے سخت غم وغصے کا اظہار کرنے لگا کیونکہ یہ چمگادڑ ان لوگوں کے لیے نہایت قیمتی شے تھا۔ دراصل اسے انہوں نے عبادت کے لیے پال رکھا تھا۔ ظالم ہیوگل نے ان کے اس معبود کو ہی مار ڈالا تھا۔ اب ایک نئے چمگادڑ کی تلاش اور اس کو پال پوس کر عبادت کے لائق بنانا ان لوگوں کے لیے ایک مشکل امر تھا۔ لہذا وہ اپنے محبوب اور معبود چمگادڑ کی ہلاکت پر سراپا احتجاج تھے۔

پُراسرار پرندے کا شکار

اس روز ایک عجیب وغریب صورت حال پیدا ہوگئی جب ہیوگل کو اپنی ایک بظاہر آسان سی مہم میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوایوں کہ ایک پرندے کے بارے میں مقامی لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ اسے مارا نہیں جاسکتا۔ مہم جو ہیوگل اس پرندے کو مار کر لوگوں کے اس اعتقاد کو غلط ثابت کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے معاون شکاریات کو ہمراہ لیکر اس عجیب وغریب اور پُراسرار پرندے کے شکار پر روانہ ہوگیا۔ جونہی انہوں نے اس پرندے کا نشانہ لیکر گولی چلانے کی کوشش کی تو پہلی بار ان کی بندوق جام ہوگئی اور دوسری مرتبہ نشانہ خطا ہوگیا۔ اور تیسری بار پرندہ ہی اُڑ گیا۔ اب بھی نہ اُڑتا تو کیا کرتا....!

اور ہتھوڑا ٹوٹ گیا

اسی طرح کا ایک واقعہ ہیوگل کے ساتھ زعفران کی پیداوار والے علاقے پامپور میں پیش آیا۔ اس نے ایک چٹان میں جڑا ہوا کوئی قیمتی پتھر یا فوسل دیکھا۔ اس نے ہتھوڑا لیکر اس پتھر کو توڑنے کی کوشش کی۔ ہتھوڑے کی ضرب چٹان پر پڑی تو چٹان کے بجائے ہتھوڑا ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اس نے بازار سے دوسرا ہتھوڑا منگوایا اور کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد اسے دوسرا ہتھوڑا مل سکا جس سے اس نے چٹان توڑ کر وہ قیمتی شے حاصل کی۔ اس طرح کے بے شمار چھوٹے موٹے واقعات ہیوگل کو دوران سفر پیش آئے جو اگرچہ نادر الوقوع اور محیر العقول نہیں تاہم ایک گونہ دلچسپی کا سامان ان میں موجود ہے اور حالت سفر میں بعض معمولی واقعات بھی دور رس نتائج اور تاثر کے حامل بن کر یادوں کے انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ یہی کچھ بیرن ہیوگل کے ساتھ بھی ہوا۔

ژاک مونٹ کی طرح اس کے ذہن میں بھی کشمیر کی جو تصویر تھی وہ بنیادی طور پر تھامس مور کی ,, لالہ رخ،، سے لی گئی تھی۔ تاہم جب اس نے اپنی آنکھوں سے کشمیر کو دیکھا تو اسے کافی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تھامس مور نے کشمیر کے رومان پرور حُسن کے پس منظر میں نظم ''لالہ رخ،، لکھی تھی تب اس بدقسمت وادی کا حُسن اپنی اصل حالت میں قائم تھا۔ باشندگان ریاست آزاد اور خوش حال تھے۔ سیر وتفریح کے مواقع موجود تھے۔ باغات اور سبزہ زار ویران نہیں ہوئے تھے۔ اس کی بہاروں کو نوچا نہیں گیا تھا۔ کشمیر کے مقامی مسلمان حکمران اور ان کے جانشین مغلیہ گورنروں نے اس کے بہار آفریں مناظر کی حفاظت ہی نہیں کی بلکہ چار چاند لگا دیے تھے۔ جگہ جگہ باغات تعمیر کرائے، مسافر خانے، سرائے، کنوئیں، نہریں، محلات اور مساجد تعمیر کروائیں۔ الغرض انہوں نے حُسن فطرت سے محبت کا ہر لحاظ سے حق ادا کیا۔ جبکہ اس کے بعد افغان اور سکھ حکمرانوں نے اس بدقسمت وادی کو مالی اور اقتصادی طور پر ہی نہیں لوٹا بلکہ اس کے فطری حُسن کو بھی گہنا دیا جس کا قبل ازیں مختلف مقامات پر ذکر آچکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہیوگل نے جب کشمیر کو دیکھا تو اسے یہ وادی اپنے تصورات سے مختلف نظر آئی۔ وہ کہتا ہے کہ ''میں نے پہلے دن کشمیر میں جو کچھ دیکھا وہ محض کھنڈرات تھے، جو کسی زمانے میں محلات ہوئے ہوں گے۔ پرانے شکستہ مکانات تھے، جو کسی زمانے میں نئے اور خوبصورت ہوئے ہوں گے .... گلیاں اس قدر گندی تھیں یہ لوگ بمشکل وہاں سے گزر سکتے تھے .... میں طویل عرصے سے اپنے خوابوں میں جس پرستان کو سجائے ہوئے تھا اس کو دیکھ کر میرا پہلا تاثر یہی تھا۔''

کشمیر کے بارے میں درج بالا رائے کے قائم کرنے میں بڑا دخل اس صورت حال کا بھی ہے جس سے ہیوگل کو گزرنا پڑا۔ جس طرح مور کرافٹ کو بھاری بھر کم زاد راہ اور

سامان سفر کی وجہ سے قدم قدم پر مشکلات اور مسائل کا سامنا پڑا تھا اور اس مصیبت نے اس کی سیر و سیاحت کا مزہ ہی کرکرا کر دیا تھا۔ اسی طرح بیرن ہیوگل بھی اپنے حالات کی وجہ سے مسلسل پریشان رہا جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے، کبھی قلی ہڑتال پر ہوتے اور کبھی خانسامے ناراض ہو کر بھاگ جاتے۔ سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا اور ساتھ لیکر پھرنا واقعی ایک دشوار امر تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی طبیعت میں ایک چڑ چڑا پن سا آ گیا تھا۔ پھر مزید بدقسمتی اس کے ساتھ یہ ہوئی کہ اس نے سیاحت کشمیر کے لیے نہ تو درست راستے کا انتخاب کیا اور نہ ہی درست موسم کا، سفر کی دشواریاں الگ مسئلہ بنی ہوئی تھیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ جب کشمیر پہنچا کشمیر میں موسمِ سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دلاور خان کے باغ میں اس نے پہلی رات ٹھٹھر کر اور جاگ کر گزاری۔ سری نگر شہر کے بارے میں درج بالا ریمارکس اس نے اسی کیفیت میں سپردِ قلم کیے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے دن جب سورج طلوع ہوا اور اس کی تمازت نے اس پر خوشگوار اثرات مرتب کیے۔ تو اس کی طبیعت کھل اٹھی۔ اس نے کشمیر کے فطری مناظر، سونامرگ کے پہاڑوں، جھیل ڈل اور مغلیہ باغات کی دل کھول کر تعریف کی۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی رائے بار بار بدلتی ہے۔ جب بور ہوتا ہے تو اسے کشمیر کا ہر منظر مایوس کن نظر آتا ہے۔ اور جب وہ ذرا اچھے موڈ میں ہوتا ہے اور اس کی طبیعت ہشاش بشاش ہوتی ہے تو اسے ہر سو ہریالی نظر آتی ہے۔ اور ہر منظر فردوسِ بریں کا عکس نظر آتا ہے۔

نشاط باغ میں

دلاور خان کے باغ میں ٹھٹھر کر رات گزارنے کے بعد دوسرے دن بیرن ہیوگل اور اس کے دونوں ہمسفر سرینگر کے مضافات اور مغلیہ دور کے باغات کی سیر کو نکل گئے۔ سب سے پہلے وہ نشاط باغ گئے وہاں ایک خاص ترتیب اور سلیقے سے بنی ہوئی پھولوں

کی کیاریوں، درختوں کی قطاروں اور روشوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ اگرچہ باغ اب زمانے کی قدر ناشناسی کا شکار تھا اور اس پر ایک سو برس سے زیادہ عرصے سے ویرانیوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے لیکن اس لٹے پٹے ویران اور خزاں رسیدہ باغ سے بھی اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اپنے دورِ عروج میں اس کی بہاروں کا عالم کیا ہوا ہوگا....!

شالیمار کی سیر

پھر تینوں سیاح ہیوگل ہنڈرسن اور وائینے شالیمار باغ جا پہنچے۔ شالیمار باغ کی حالت نشاط باغ سے نسبتاً بہتر تھی کیونکہ سکھ اور افغان گورنر اسے اپنی ذاتی سیر گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے اور کشمیریوں پر مظالم کے پہاڑ توڑتے ہوئے جب اکتا جاتے یا اپنے ظلم سے خود بھی کبھی کبھار شرما جاتے تو وہ اس باغ میں آ کر جی بہلایا کرتے تھے لہذا وہ اس کی مرمت پر بھی تھوڑی بہت توجہ دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر ویرانی اور شکستگی کا وہ عالم ابھی طاری نہ ہوا تھا جس کا مشاہدہ وہ نشاط باغ میں کر چکے تھے۔ نشاط باغ کا بڑا حصہ اب عدم توجہی کا شکار ہو کر ویران ہو چکا تھا اور اس کی زمین پر جا بجا لوگوں نے جھگیاں بنا کر رہائش اختیار کر لی تھی۔

چار چنار

تینوں سیاح اب ایک کشتی کے ذریعے جھیل ڈل میں بنے ہوئے جزیرے "چار چنار" کی سیر کو پہنچ گئے ساڑھے چار سال قبل ان کا پیشتر و سیاح جواں مرگ ژاک مونٹ بھی اس جزیرے پر آیا تھا اور اس کی ویرانی پر آنسو بہا کر گیا تھا۔ تب شدید گرمی تھی جبکہ اس مرتبہ گرمی کی شدت ختم ہو چکی تھی اور ڈھلتے سورج کی روپہلی کرنیں بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ دیگر تفریحی مقامات کی طرح اس جزیرے پر بھی ویرانیوں نے

ڈیرے ڈالے ہوئے تھے جیسا کہ ژاک مونٹ نے جزیرے پر چنار کے درختوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ چار میں سے دو چنار امتدادِ زمانہ کی نذر ہو چکے تھے۔اب بھی یہی صورتِ حال تھی جو بیرن ہیوگل اوراس کے ساتھیوں کے مشاہدے میں آئی۔

نسیم باغ

سورج مغربی پہاڑوں کی اوٹ سے الوداعی سنہری کرنیں بکھیر رہا تھا کہ تینوں سیاح چار چنار سے کشتی کے ذریعے نسیم باغ پہنچے۔ ہری پربت کے دامن میں اکبر اعظم کا لگوایا ہوا یہ باغ حضرت بل کے پہلو میں واقع ہے۔ اکبر نے تب سے دوسو سال قبل باغ میں ایک خاص ترتیب اور سلیقے سے چنار کے ایک ہزار درخت لگوائے تھے۔اب بھی اگرچہ بڑی تعداد میں چنار کے بوڑھے درخت موجود تھے تاہم باغ کی وہ آن بان اور شان وشوکت برقرار نہ رہی تھی۔اس موقع پر وائینے اپنے ہم سفروں ہنڈرسن اور ہیوگل سے احتجاج کرتا ہے کہ مقامی رواج کے مطابق دن کے پہلے پہر میں اس باغ کی سیر کو آنا چاہیے تھا کیونکہ مقامی باشندے ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ دن کے پہلے حصے میں نسیم باغ کی سیر اور شام کے وقت نشاط باغ کی سیر کرنا اس دور کے رواج میں شامل تھا۔سکھوں کے عہد میں اس باغ کے اکثر درخت کاٹ کر بیچ دیئے گئے ۔خصوصاً گورنر مہان سنگھ نے نسیم باغ ، نشاط باغ اور شالیمار باغ سے بڑی تعداد میں چنار کے دیوہیکل درخت کٹوا کر بیچ دیے تھے۔

تخت سلیمان پر

سری نگر شہر کے ساتھ ہی واقع بلند پہاڑی ،جسے ہندو شنکر اچاریہ اور مسلمان تخت سلیمان کہتے ہیں ،ایک خوبصورت تفریحی مقام ہے۔ یہاں سے سری نگر شہر کا منظر بڑا دل آویز ہے ۔ اگلے دن تینوں سیاح اس مقام پر آپہنچے۔دن کا کھانا وہ ہمراہ لائے

تھے۔ یہیں انہوں نے کھانا بھی کھایا اور سارا دن یہیں گزرا۔ وائینے یہاں سے وادی کے مختلف مناظر اور مقامات کی تصویر کشی کرتا رہا۔

گورنر سے ملاقات

تیسرے دن گورنر مہان سنگھ کی طرف سے بلاوا آیا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس ناپسندیدہ کردار کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ شیر گڑھی محل میں گورنر نے ان سیاحوں کا استقبال کیا۔ بیرن ہیوگل اس کی شکل اور کرتوتوں کو سخت ناپسندیدگی سے دیکھتا تھا۔ گورنر اور اس کے محافظ قیمتی اور رنگین ریشمی لباس میں ملبوس تھے جبکہ وادی کے عام باشندوں کے جسموں پر چیتھڑے بھی بمشکل دیکھے جا سکتے تھے۔

ہیوگل نے دیکھا کہ کچھ نوجوان فرش پر بٹھائے گئے ہیں۔ یہ لوگ پونچھ اور دوسرے سرحدی علاقوں سے گرفتار کر کے لائے گئے تھے اور ان پر الزام تھا کہ یہ لوگ سکھوں کے خلاف بغاوت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ قیدی تھے اور روزانہ انہیں گورنر کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا تا کہ گورنر یہ تسلی کر سکے کہ اس کے باغیوں کے ساتھ اس کی مرضی اور منشاء کے مطابق ہی سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ ان میں سے کچھ لداخ وغیرہ کے علاقوں کے شہزادے تھے جن کی ریاستوں کو رنجیت سنگھ نے فتح کر کے انہیں قیدی بنا لیا تھا۔ گورنر ان سب لوگوں کو یورپی سیاحوں کے سامنے لا کر ایک طرف تو ان قیدیوں کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اس کے انگریزوں کے ساتھ بڑے مثالی تعلقات ہیں اور دوسری طرف انگریز سیاحوں کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ ریاست کا مضبوط ترین حکمران ہے۔ یوں وہ انگریز سیاحوں پر اپنی طاقت اور اقتدار کا رعب جمانا چاہتا تھا۔

ژاک مونٹ نے جب کشمیر کا سفر کیا تھا تو اس وقت کا گورنر ظالم ہونے کے باوجود بعض خوبیوں کا حامل بھی تھا۔ جوزف وولف کی کشمیر آمد کے موقع پر اس نے مسلمان، ہندو، سکھ،

بودھ اور عیسائی علماء کی ایک بین المذاہب کانفرنس منعقد کی تھی۔ وہ علم وفن سے کچھ دلچسپی رکھتا تھا۔ لیکن مہان سنگھ ان خوبیوں سے عاری تھا۔ علم وفن کی اس کے نزدیک کوئی قدر نہ تھی۔ وہ ایک جاہل اور قصاب صفت شخص تھا۔ ہیوگل کے بقول کشمیری ظلم کے ایک ایسے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے کہ ریاست کے تمام باشندوں کی حالت بھکاریوں سے کچھ مختلف نہیں تھی۔

سری نگر پرانے شہر کی سیر

گورنر سے اس ناخوشگوار سی ملاقات جسے ملاقات کی بجائے صرف درشن ہی کہا جاسکتا ہے سے واپسی پر ہیوگل ہنڈرسن اور وائینے نے کشتی کے ذریعے پرانے سری نگر شہر کی سیر کا پروگرام بنایا۔ وہ باری باری ساتوں پلوں کے پاس رکتے، ان کے طرزِ تعمیر کا مشاہدہ کرتے، مختلف عمارات اور مساجد کا معائنہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک وائینے کو یاد آیا کہ اس کی نقشہ کشی کی کتاب اس کی رہائش گاہ، دلاور خان کے باغ میں رہ گئی ہے۔ اسے لانے کے لیے ایک ملازم کو بھیجا گیا۔ وہ اکیلے اپنی Sketch book کے انتظار میں رُک گیا۔ جبکہ ہیوگل اور ہنڈرسن جہانگیر کی محبوب ملکہ نور جہاں کی تعمیر کردہ عظیم الشان پتھر مسجد کو دیکھنے چلے گئے۔ ادھر وائینے اپنی کشتی میں بیٹھا Sketch book کا منتظر تھا۔ جونہی ملازم کتاب لایا، وائینے نے بیتابی سے اپنے دوسرے ساتھیوں تک پہنچنے کے لیے کشتی سے چھلانگ لگا دی۔ وہ ساحل کے بجائے دریا کے منجمد کردینے والے پانی میں گر پڑا۔ ساحل پر کھڑے مقامی باشندوں نے شور مچایا۔ قبل اس کے کہ اس کی مدد کو کوئی دریا میں چھلانگ لگاتا وہ بڑی خوبصورتی سے تیرتے ہوئے دریا کے عین بیچ میں گول گول چکر لگانے لگا۔ کنارے پر کھڑا ہجوم اسے اس مہارت سے تیرتے ہوئے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ بالاخر وہ تیرتا ہوا کنارے پر آلگا۔

مسجد داراشکوہ

وائینے کے کپڑے بری طرح بھیگ چکے تھے۔وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔اسے ملازموں کے ساتھ واپس رہائش گاہ پر بھیج دیا گیا۔تا کہ وہ وہاں کپڑے بدل سکے اور آگ جلا کر حرارت حاصل کر سکے۔ ہیوگل اور ہنڈرسن نے اپنی سیاحت جاری رکھی۔ وہ تنگ وتاریک گلیوں سے ہوتے ہوئے پیدل ہری پربت کی جانب نکل گئے۔راستے میں انہوں نے کثیر منزلہ عمارتیں دیکھیں جو ماضی کے کشمیر کی خوشحالی اور عظمت کی عکاسی کر رہی تھیں۔جب یہاں کے لوگ آزاد اور خوشحال تھے، عالیشان عمارتوں میں خوش وخرم زندگی گزارتے تھے۔لیکن اب وہاں ویرانیوں نے ڈیرے جما لیے تھے۔ یہ عمارتیں اب کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ ہری پربت میں انہوں نے اکبری دور کی نشانیاں دیکھیں۔جن میں داراشکوہ کی بنائی ہوئی مشہور مسجد نمایاں تھی جو اس نے اپنے استاد اور پیشوا ملا اخوند شاہ کے لیے بنائی تھی۔ ہیوگل لکھتا ہے کہ کشمیر کے طول وعرض سے لائی گئی بڑی بڑی تراشیدہ سلوں کے بنے ہوئے ستونوں اور محرابوں والی یہ مسجد خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے۔یہ سنگ مرمر اور سنگ سیاہ کے خوبصورت پتھروں سے بنائی گئی تھی۔اس کے دروازے پورے پورے پتھر کی سلوں کے بنے ہوئے تھے۔یہ اس مہارت سے تراشے گئے تھے کہ ان پر شیشوں کا گمان ہوتا تھا لیکن ماضی کے کئی سالوں سے یہ مسجد ویران ہو چکی تھی۔

شال فیکٹریوں میں

ہری پربت کی چوٹی پر انہیں قلعہ ہری پربت کے اندر جانے کی اجازت نہ مل سکی کیونکہ وہاں سکھ فوج کے سپاہی قیام پذیر تھے۔انہوں نے ان سیاحوں کو اندر جانے سے روک دیا تھا۔اس لیے کہ ان کے پاس سرکار کا جاری کردہ خصوصی اجازت نامہ نہ تھا۔وہاں

سے واپس لوٹے تو راستے میں تیسرا ساتھی وائینے انہیں ملا اور اب تینوں نے مل کر شال فیکٹریوں کی سیر کا پروگرام بنالیا۔ ان شال فیکٹریوں کے مالکان کی حالت زار دیکھ کر ان سیاحوں کو بڑا افسوس ہوا کہ دنیا بھر کو قیمتی ملبوسات فراہم کرنے والے یہ شال باف خود چیتھڑے پہنے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی ساری کمائی ظالم حکمران ٹیکس کے نام پر ہتھیا لیتے ہیں اور انہیں برہنگی اوڑھنے اور بھوک کھانے کو ملتی ہے اور بس!

ویری ناگ کی جانب

یہاں سے ہیوگل اور اس کے ساتھی کشتی کے ذریعے جنوبی کشمیر میں دریائے جہلم کے منبع چشمہ ویری ناگ، اچھابل، مارتنڈ اور اونتی پورہ کے تباہ شدہ مغل باغات اور قدیم مندر دیکھنے روانہ ہوگئے۔ اسی راستے پر ان کا پیش رو سیاح مور کرافٹ بھی سفر کر چکا تھا۔ مارتنڈ میں ہندوؤں کا قدیم مندر، اونتی پورہ کے کھنڈرات، اچھابل کے باغات، خصوصاً داراشکوہ کا باغ اور ویری ناگ میں نور جہاں کا تعمیر کردہ چشمہ یہ سب کچھ انہوں نے اشک بار آنکھوں سے دیکھا۔ اسلام آباد، ویری ناگ، اچھابل، مارتنڈ اور اونتی پورہ کی سیر کے پانچ روز بعد وہ واپس سری نگر آ گئے۔

یادگار تختی کی تنصیب

اب موسم بہت زیادہ سرد ہو چکا تھا اور کشمیر میں قیام مزید جاری رکھنا دشوار تر ہو رہا تھا۔ اب وہ واپسی کا ارادہ کر رہے تھے کہ ہیوگل کو ایک اچھوتا خیال سوجھا۔ اس نے اپنے سفر کی یادگار کے طور پر ایک کتبہ تحریر کر کے ''چار چنار'' نامی جزیرے میں نصب کرنے کا تصور پیش کیا۔ جس کے ذریعے ماضی کے مغربی سیاحوں کو خراج عقیدت بھی پیش کیا جا سکے اور آنے والوں کے لیے اپنے سفر کی یادیں بھی محفوظ کی جاسکیں۔ باقی دونوں سیاحوں نے بھی

اس خیال سے اتفاق کیا۔اب مسئلہ سنگ مرمر کی ایک بڑی سل کی فراہمی کا تھا جس پر مجوزہ تحریر کندہ کی جا سکے۔ بالآخر ہیوگل نے ہی تجویز پیش کی کہ ہری پربت پر داراشکوہ کی مسجد جس کی ویرانی پر وہ قبل ازیں آنسو بہا چکا تھا، کا سنگ مرمر کا پورا دروازہ اکھاڑ کر لایا جائے اور اسی پر تحریر کندہ کر کے چار چنار میں نصب کی جائے۔اس مقصد کے لیے اس نے اپنے ملازم مائیکل کو کچھ مزدوروں کے ہمراہ بھیجا لیکن وہاں کے محافظوں نے دروازہ نہ اکھاڑنے دیا۔اس پر ہیوگل خود یہ مہم سر کرنے کے لیے روانہ ہوا۔لیکن اس وقت تک وہاں مقامی مسلمان کا اچھا خاصا جم غفیر جمع ہو چکا تھا۔وہ اس کے دروازے کی چوری کی گھناؤنی کوشش کے خلاف سراپا احتجاج بن گئے تھے۔ہیوگل بمشکل وہاں سے جان بچا کر ناکام اور نامراد واپس اپنی قیام گاہ پر آ گیا۔اب مسجد کے دروازے کی چوری کا خیال اس نے ذہن سے نکال دیا۔دریں اثناء ان برطانوی باشندوں کی طرف سے مسجد کی بے حرمتی کی اس گھناونی کوشش کی خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور ستم رسیدہ کشمیری اپنے مذہب کی یہ توہین برداشت نہ کر سکے، یوں صورت حال سخت کشیدہ ہو گئی۔قبل اس کے کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہوتا، ہیوگل نے صورت حال کی نزاکت کو بھانپ لیا اور مسجد کا دروازہ اکھاڑنے کا ارادہ ترک کر کے کسی اور جگہ سے کوئی مناسب پتھر حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ بالآخر انہیں شالیمار باغ سے سنگ مرمر کی مطلوبہ سل مل گئی۔انہوں نے ایک کاریگر کو بلا کر اس کو کانٹ چھانٹ کر کے مناسب شکل دینے کے بعد انگریزی زبان میں اس پر ایک تحریر کندہ کروائی۔تحریر میں مختلف ادوار میں کشمیر کی سیاحت کو آنے والے سیاحوں کے نام درج تھے۔یہ تحریر خود ہیوگل کی تیار کردہ تھی۔سیاحوں نے اس فہرست میں مسیحی مشنریوں کا نام قصداً درج نہیں کیا کیونکہ وہ ان مشنریوں کو سیاح تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔اب مسئلہ اس سل کو چار چنار نامی جزیرے میں نصب کرنے کا تھا۔جس کی انہیں اجازت نہ ملی۔کیونکہ مہاراجہ

رنجیت سنگھ کی تحریری اجازت کے بغیر ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ لہذا انہوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خدمت میں اس امر کی درخواست روانہ کردی لیکن درخواست کی منظوری تک وہ کشمیر میں مہینوں اپنے قیام کو طوالت نہیں دے سکتے تھے۔ انہوں نے یہ تختی محفوظ ہاتھوں میں اس یقین دہانی کے ساتھ دے دی کہ جوں ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار سے منظوری صادر ہوگی یہ تختی مقررہ جگہ پر نصب کردی جائے گی۔ تختی پر کنندہ کرائی گئی تحریر یہ تھی:

THREE TRAVELLERS,BARON CHARLS
VON HUGEL FROM JAMMU, JOHN HINDERSON FROM
LADAKH, GODFREY THOMAS WIGNE FROM
ISKARDO,WHO MET ON SRINEGAR ON 18TH NOVEMBER 1838
HAVE CAUSED THE NAMES OF THOSE EUROPEAN
TRAVELLERS, WHO HAVE PREVIOUSLY VISITED KASHMIR.
BERNIER 1664 FOSTER 1786, MOORCROFT,
TREBECK AND GUTHERIE 1822,JAQUEMONT 1831,
JOSEPH VOLF 1832.OF THESE, THREE ONLY COULD LIVE,
TO RETURN TO THEIR NATIVE COUNTRIES.

2 دسمبر 1853ء کی یخ بستہ صبح ہینڈرسن کوہ ہندوکش کے شمالی علاقوں کی سیاحت پر روانہ ہوگیا۔ وہ دشوار گزار علاقوں کی مہم جوئی کے دوران ایک سال کے بعد حالت سفر میں ہی جاں بحق ہوگیا تھا۔ اسی اثناء میں گاڈفر نے دلاور خان کے باغ کا ایک قلمی خاکہ تیار کیا تھا۔ انسانوں، گائے، بھیڑیوں، بکریوں، حتیٰ کہ پرندوں تک کی بھی تصویر کشی کی گئی تھی۔ یہ تصویر اس نے ایک یادگار کے طور پر بیرن چارلس ہیوگل کو پیش کی۔ اور اگلی صبح وہ بھی ہیوگل کو خدا حافظ کہہ کر لداخ کے سفر پر روان ہوگیا۔ دو سال کے بعد 1837ء میں لداخ سے واپسی پر وہ پھر سرینگر سے گزرا۔ اسے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان کا یادگار پتھر ابھی تک چار چنار جزیرے میں نصب نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے مہاراجہ سے حصول اجازت کے لیے نئے

سرے سے درخواست دی۔ جب درخواست منظور ہوئی تو اس نے اپنی نگرانی میں یہ پتھر چار چنار میں نصب کروا دیا۔ ایک سال کے بعد 1938ء میں وہ پھر گھومتا پھرتا سری نگر آیا تو اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ پتھر بدستور اپنی جگہ موجود تھا۔ یہ پتھر 1947ء تک اپنی جگہ موجود رہا۔ لیکن معلوم نہیں اس کے بعد اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ 1947ء کے ہنگاموں میں کسی نے یادگار پتھر کو برطانوی استعمار کی یادگار سمجھ کر جھیل ڈل کی نذر کر دیا تاہم اس پتھر کے بارے میں اس کے علاوہ یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ہیوگل 9 دسمبر بروز سوموار سری نگر سے براستہ بارہ مولہ واپسی کے سفر پر روانہ ہوا۔ بارہ مولہ سے آگے دریائے جہلم سینکڑوں فٹ گہرائی سے چٹانیں کاٹ کر اپنا راستہ بناتا ہوا گزرتا ہے۔ واپسی کے سفر میں اس نے اگلے چند دن اسی دریا کے ساتھ ساتھ عمودی ڈھلانوں اور تنگ راستوں سے اپنا سفر جاری رکھنا تھا۔ اوڑی سے اس دور میں بھی پونچھ اور راجوری کو ایک راستہ جاتا تھا۔ ہیوگل کی سفر پسند اور متجسس طبیعت اس راستے کی جادہ پیمائی کی بھی متمنی تھی۔ لیکن موسم کی شدت اس انجانے راستے پر قسمت آزمائی کرنے میں مانع رہی۔ بقول ہیوگل۔

> ''اگر سردی کا موسم مجھے باز نہ رکھتا تو بخوشی اس سڑک کو دریافت کرتا جو پونچھ کے مقام پر اس شاہراہ سے جا ملتی ہے جو کشمیر کو پنجاب سے ملاتی ہے۔ اس طرح میرے اندازے کی تصدیق ہو جاتی کہ کشمیر کا بہترین راستہ پونچھ اور اوڑی سے ہی گزر کر جاتا ہے۔ کیونکہ اس پیر پنجال سے بچا جا سکتا ہے اور یہ راستہ بھی سارا سال کھلا رہتا ہے''

اوڑی کے مقام پر اس نے رسوں کے پل کے ذریعے دریائے جہلم عبور کیا۔ رسوں کا یہ پل بڑا خطرناک تھا جسے عبور کرنا ہیوگل کے بقول ایک خطرناک قسم کی مہم جوئی سے

کم نہ تھا۔ ہر تین فٹ کے فاصلے پر ایک گرہ ڈال کر رسے کو پکڑنے یا اس میں قدم جمانے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ اس نے بمشکل یہ پل عبور کیا۔ ہیوگل کے سفرنامے میں اس پل کا ایک قلمی خاکہ بھی شامل ہے جس سے دو سیاحوں کو گزرتے دکھایا گیا ہے۔ یہاں سے چل کر وہ شاہدرہ نام کے گاؤں پہنچے۔ شاہدرہ کے قریب ہی اس نے ایک ایسی جگہ دیکھی جہاں چٹانوں کو اس انداز سے کاٹا گیا تھا جیسے کسی نے کوئی کتبہ لکھنے کے لیے جگہ بنائی ہو۔ مقامی لوگ اس کے بارے میں مختلف توہمات کا شکار تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ''جیجا'' نامی کسی دیو کا ڈیرا ہے جو رات کو یہاں آ کر قیام کرتا ہے اور اس کے نتھنے پر پانچ سو جونکیں چمٹی ہوتی ہیں ۔ کسی کا کہنا تھا کہ اس کتبہ پر شہنشاہ اکبر نے اپنا نام کندہ کرایا تھا۔ امتداد زمانے سے نام تو مٹ گیا جس طرح اکثر بڑے بڑے بادشاہوں کے نام ونشان تک مٹ جاتے ہیں البتہ وہ جگہ اب بھی باقی ہے جو اکبر کے عہد کی یاد دلاتی ہے۔ ہیوگل کے خیال میں یہ وہ مقام ہے جہاں افغان حکمران تیمور شاہ کے لشکر اور کشمیر کے نائبین سلطنت کے درمیان جنگ ہوئی تھی اور یہیں سے تخت قابل کی کشمیر پر حکمرانی کے زوال کا آغاز ہوتا ہے۔ اس تنگ درہ ہی کے بارے میں ہیوگل کا خیال ہے کہ اگر اس روائت میں کچھ بھی صداقت ہے کہ کسی زمانے میں وادی کشمیر پانی سے بھری ہوئی تھی اور بارہ مولہ کے قریب پہاڑ کاٹ کر پانی کا اخراج کر کے وادی کو آبادی کے قابل بنایا گیا تو یہی وہ مقام ہو سکتا ہے جہاں سے دریا کا پاٹ اتنا تنگ اور دریا اتنی گہرائی میں بہتا ہے کہ اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ کسی نے یہاں سے شگاف کر کے دریا کا راستہ بنایا ہوگا۔ لیکن ہیوگل کے نزدیک یہ خیال کہ پہاڑ کاٹ کر دریا کا راستہ بنایا گیا اور وادی سے پانی کا اخراج کیا گیا محض توہم پرستی ہے۔ صدیوں کے قدرتی عمل کے نتیجے میں پانی کے بہاؤ سے پہاڑ میں کٹاؤ پیدا ہوا ہے اور رفتہ رفتہ دریا گہرائی میں اترتا چلا گیا ہے۔ یہ کسی دیو کا کارنامہ نہیں بلکہ قادر مطلق کے نظام فطرت کا ایک شاہکار ہے۔

شاہدرہ سے ۸ کوس کے فاصلے پر کٹھائی نامی گاؤں سے اس کا گزر ہوا تو وہاں اسے زیتون (کہو) کے درختوں کے جھنڈ نظر آئے۔ان درختوں کو اس نے یورپ کے جنگلی زیتون کے مشابہ قرار دیا ہے جس سے تیل نہیں نکالا جا سکتا۔اب موسم میں وہ سردی نہ رہی تھی جس نے قیام کشمیر کے دوران ہیوگل کا جینا دوبھر کر رکھا تھا بلکہ اب ایک گونہ حرارت کا احساس اسے فرحت اور تازگی بخشنے لگتا ہے۔اس کی طبیعت کھل اٹھتی ہے اور اس کے مزاج کا وہ چڑچڑا پن جو قیام کشمیر کے دوران اس کی فطرت کا جز نظر آتا تھا یکسر غائب جاتا ہے۔اب ایک تنک مزاج اور تند خو ہیوگل کی جگہ ایک ہنستا مسکراتا خوش باش ہیوگل لے لیتا ہے۔

ناخوشگوار واقعہ

رات اس نے کھٹائی میں ہی قیام کیا۔یہاں ایک مسلمان حکمران زبردست خان کا ایک قلعہ بھی تھا جو مٹی اور پتھر سے بنایا گیا تھا۔سلطان زبردست خان کا واحد وارث اس کا پوتا تھا جو اس وقت کشمیر میں نظر بند تھا۔اس کے قلعہ میں اس کے کچھ مسلمان ملازمین تھے۔ قلعہ کے اندر داخل ہونے اور زبردست خان کے بارے میں استفسار کرنے پر ہیوگل اور قلعہ کے ملازمین کے درمیان تو تکار ہوگئی۔ہیوگل کے ہمسفر گھبرا گئے کہ کہیں رات کو مسلمان قلعے سے نکل کر ان پر حملہ ہی نہ کردیں لیکن خیر گزری کہ مسلمان ملازمین سے انہیں کوئی گزند نہ پہنچا۔دوسرے دن کھٹائی سے روانگی کے وقت پھر مسئلہ پیدا ہو گیا۔ہیوگل کے قافلے کے ایک سکھ افسر نے قلعہ میں داخل ہونے کی کوشش کی اور قلعہ کے ملازمین نے اسے زبردستی روک دیا۔وہ شکایت لیکر ہیوگل کے پاس پہنچا۔ہیوگل کے قافلے میں سکھ افسروں اور سپاہیوں کی موجودگی سے قلعہ والوں کو یہ شبہ ہو گیا کہ یہ انگریز بھی سکھ فوج کا کوئی افسر ہے۔ ہیوگل نے جا کر قلعہ کے انچارج کے سامنے اپنی پوزیشن واضح کی کہ وہ رنجیت سنگھ کی فوج کا افسر یا ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی ملازم نہیں بلکہ ایک آزاد یورپی سیاح ہے اور اس کے ساتھ سکھ

افسر اور سپاہی رنجیت سنگھ نے صرف اس کی حفاظت کے لیے متعین کر رکھے ہیں ورنہ اس کا سکھ دربار سے کوئی تعلق نہیں۔اس کی اس وضاحت پر قلعہ کے انچارج نے خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا اور اسے قلعہ کے اندر آنے کی دعوت دی۔ ہیوگل نے قلعہ کے اندر جانے سے معذرت کی کیونکہ اس کی یہاں سے روانگی کا وقت ہو گیا تھا۔

اٹلی کے گاؤں سے مشابہت

سری نگر سے روانگی کے ایک ہفتہ بعد 14 دسمبر کو وہ ہٹیاں بالا پہنچ گیا۔یہ مقام اسے بہت بھلا معلوم ہوا یہاں سے وادی فراخ ہونا شروع ہو جاتی ہے اور تنگی اور گھٹن کا احساس نہیں رہتا۔ہٹیاں کے قریب ہی ایک سطح مرتفع پر واقع کوسولی نام کا ایک گاؤں اس کی نظروں میں سما گیا۔اس گاؤں پر اسے اٹلی کے کسی گاؤں کا گمان ہوا۔اس کے بیان کے مطابق دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر آباد کوسولی نامی گاؤں میں اس وقت بھی عالیشان مکانات تعمیر شدہ تھے۔جو اس کے باشندوں کی دولت و ثروت کا پتہ دے رہے تھے۔

مظفر آباد آمد

بیس دسمبر بروز منگل اس کا قافلہ مظفر آباد پہنچا۔دریائے جہلم اور دریائے نیلم کے سنگم پر آباد مظفر آباد اس وقت ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔جس کی آبادی 2100 نفوس پر مشتمل تھی۔مظفر آباد کا چھوٹا سا بازار دریا سے 200 سو فٹ کی بلندی پر ایک ندی کے کنارے آباد تھا۔غالباً 8 اکتوبر 2005ء کے زلزلہ سے مہندم ہونے والی ضلع کچہری اور اس کے قرب و جوار میں چند دکانوں اور کچھ مکانوں پر مشتمل علاقہ ہی اس وقت کا مظفر آباد تھا جو زیتون (کہو) کے درختوں سے گھرا ہوا تھا یہ نیم قصباتی منظر اسے بہت بھلا لگا۔اس پیالہ نما وادی میں جس کے چاروں طرف پہاڑوں نے اس وقت تک برف کی چادر اوڑھ لی تھی۔

اس کا خیمہ ایک چبوترے پر کھو کے درخت کے نیچے نصب کیا گیا تھا۔

ہیوگل کے قافلے کی اس وادی میں آمد کا منظر بھی قابل ذکر ہے۔ گھوڑوں، ٹٹوؤں، قلیوں، مزدوروں اور سکھ محافظوں پر مشتمل ایک بڑا قافلہ جب اس چھوٹے سے قصبے میں آوارد ہوا تو مقامی لوگوں کے لیے گویا یہ ایک تماشا تھا۔ سامان کھولا جا رہا تھا، خیمے نصب کیے جا رہے تھے، ہیوگل چیخ چیخ کر خیموں کے تنصیب اور سامان کے ترتیب کے متعلق ہدایات جاری کر رہا تھا۔ مقامی آبادی سے مختلف لباس، اجنبی خدوخال اور اجنبی زبان کے حامل لوگوں کو اتنی بڑی تعداد میں اس چھوٹی سی بستی میں دیکھ کر اردگرد کے مقامی لوگ اور خصوصاً بچے دوڑے بھاگے ان کے پاس آئے اور دائرے کی شکل میں انہیں گھیر لیا۔ وہ خیموں کی تنصیب اور سامان کے کھولنے کا تماشہ دیکھنے لگے۔

نیم خودمختار ریاست

دریائے نیلم اور دریائے جہلم کی وادیوں پر مشتمل مظفرآباد اس وقت ایک نیم خودمختار ننھی سی ریاست تھی جس کا حکمران اس وقت زبردست خان تھا۔ یہ ریاست ماضی میں اپنے زبردست محل وقوع اور جغرافیائی اور سٹریٹیجک اہمیت کی حامل تھی جب کشمیر افغانوں کے قبضے میں تھا۔ افغانوں کے زوال کے بعد اس ریاست کا وہ پہلے والا ٹھاٹھ باٹ نہ رہا تھا۔ اب یہ ایک کمزور ریاست تھی۔ اس کی غربت کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ جب ہیوگل نے یہاں کے حکمران زبردست خان کو پیغام بھجوایا کہ وہ اس سے ملنے اس کے گھر آنے کا متمنی ہے۔ تو زبردست خان نے جواباً معذرت کی کہ اس کا بوسیدہ اور شکستہ مکان ہیوگل جیسے مہمان کے شایان شان نہیں ہے اور اس کی بجائے وہ خود چل کر ہیوگل سے ملنے اس کے خیمے میں آ گیا۔

زبردست خان سے ملاقات

کابلی لباس اور پوستین لگے فرغل میں ملبوس سلطان زبردست خان اپنے چند خادموں کے ہمراہ ہیوگل کے خیمے میں پہنچا تو وہ بظاہر تنومند نظر آنے کے باوجود اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ خادموں نے سہارا دے کر اسے کرسی تک پہنچایا۔ ہیوگل اس کی خوبصورتی اور شکل وصورت سے اتنا متاثر ہوا کہ لکھتا ہے کہ ''میں ایسے خوبصورت خدوخال شاذ ونادر ہی دیکھے ہوں گے۔ ناک میں ہلکا سا خم، ابرو کمان کی مانند، کھلی پیشانی، ان سب میں اتنی مطابقت کہ سنجیدگی ٹپکے۔ سفید داڑھی نے اس کے متفکر چہرے کا ایک حصہ ڈھانپا ہوا تھا''۔

ہیوگل کے نزدیک اس کی نقاہت، کمزوری اور اندر کے کھوکھلے پن کی وجہ شراب نوشی تھی جس کا بقول ہیوگل کے، اس علاقے کے مسلمان بری طرح شکار تھے۔ یہی چیز اس ریاست کی غربت اور مفلوک الحالی کی بھی ایک اہم وجہ تھی۔ ہیوگل نے اسے شراب سے پرہیز کرنے کا کہا۔ سلطان زبردست خان کی جسمانی کیفیت تو ایسی تھی ہی، ذہنی کیفیت بھی جسمانی کیفیت سے چنداں مختلف نہ تھی۔ ایک ایسا شخص جس کا کوئی عزیز رشتہ دار زندہ نہ بچا ہو، جس کا جواں سال اکلوتا بیٹا کچھ ہی عرصہ قبل چل بسا ہو، جس کا وارث صرف ایک پوتا اس دنیا میں زندہ ہو، لیکن وہ بھی کشمیر کے سکھ حکمران کے پاس یرغمال ہو، اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی زندگی کی آخری خواہش یہی تھی کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے پوتے کو زندہ سلامت دیکھ سکے۔ اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے متعدد بار اپنے نوجوان پوتے کی رہائی کے لیے التجائیں کی تھیں لیکن رنجیت سنگھ کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ جب کشمیر افغانوں کے زیر تسلط تھا تو مظفرآباد کو اس وقت محاصل کی مد میں ایک لاکھ سالانہ تک آمدنی ہو جاتی تھی۔ لیکن ہیوگل کے وقت یہ آمدنی گھٹ کر اتنی کم ہو چکی تھی کہ اس وقت ریاست کی کل آمدنی صرف تیس ہزار سالانہ تک رہ گئی تھی۔ اس میں سے بھی چھ ہزار سالانہ کشمیر کے سکھ حکمران کو بطور خراج ادا کرنا پڑتے تھے جبکہ کشمیر کی حکومت اس سے دگنا

وصول کرنے کی در پے تھی۔

قلعہ پلیٹ

دریائے کشن گنگا (موجودہ نیلم) کے کنارے اکبری عہد کا قلعہ تب بھی موجود تھا اور اس میں سکھ سپاہی قیام پذیر تھے۔ یہاں موجودہ نیلم پل کی جگہ کشتیوں سے دریائے نیلم عبور کیا جاتا تھا۔ یہیں سے ہیوگل نے ایک شکستہ سی کشتی کے ذریعے دریا عبور کیا اور ایک خشک نالے کے راستے تقریباً تین ہزار فٹ تک کی بلندی پر پہاڑ کی چوٹی پر دب گلی ''شہید گلی'' پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں بھی ایک قلعہ تھا جسے فتح گڑھ کا قلعہ کہتے تھے۔ یہاں سے ایک طرف مظفر آباد کی پیالہ نما وادی اور دوسری طرف دریائے کنہار کی وادی نظر آتی تھی۔ پہاڑ کی چوٹی پر واقع قلعہ فتح گڑھ اس وقت تک شکست و ریخت کا شکار ہو چکا تھا اور اب وہاں ڈاکوؤں کا بسیرا تھا۔ یہ ڈاکو مظفر آباد کی طرف آ کر لوٹ مار کرتے اور واپس وہاں جا کر قیام کرتے تھے۔ یہ راستہ یہاں سے آگے دریائے کنہار کی وادی میں داخل ہو جاتا تھا۔ قدم قدم پر رہزنوں کا خوف دامن گیر تھا۔ ہیوگل کی حفاظت پر مامور سکھ سپاہیوں نے اسے بلیک میل کرنے کے لیے اس سے نو روپے فی کس یومیہ کے حساب سے طلب کیے اور کہا کہ ان کے سردار کو دس گنا یعنی نوے روپے یومیہ ادا کیے جائیں بصورت دیگر اس پر خطر سفر پر جانے سے انکار کر دیں گے۔ ہیوگل ان کی اس بلیک میلنگ کو سمجھتا تھا۔ اس نے بالکل انکار کر دیا۔ بالآخر وہ منت سماجت کر کے ''پرانی تنخواہ'' پر کام کرنے پر تیار ہو گئے۔ یوں ہیوگل کا یہ قافلہ سترہ دسمبر 1838ء کو مظفر آباد سے ہزارہ کی سمت نکل گیا جہاں سے وہ مانسہرہ اور ایبٹ آباد سے ہوتے ہوئے حسن ابدال کے راستے واپس پنجاب کی حدود میں پہنچ گیا۔

کشمیر سے روانگی کے ایک سال بعد وہ بھی اپنے پیشرو سیاحوں کی طرح اپنا سفر حیات مختصر کر کے جہاں فانی سے کوچ کر گیا۔

۱۴

ایک شہید وفا

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں کشمیر میں ایک اور رومانوی داستان نے جنم لیا جو ایک عرصہ تک کشمیر، ہندوستان اور انگلستان کے ڈرائنگ رومز کی گفتگو کا عنوان بنی رہی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ 1831ء میں برطانوی فوج کا ایک کرنل تھروپ (Colonel Throp) ایک سیاح کی حیثیت سے کشمیر آیا۔ اپنی سیاحت کے دوران وہ توشہ میدان میں خیمہ زن تھا کہ اس کی نظر جانی نامی ایک کشمیری لڑکی پر پڑی۔ جانی کشتواڑ کے حکمران راٹھور خاندان کے سربراہ دائم راٹھور کی بیٹی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بے پناہ حُسن و جمال سے نوازا تھا۔ کرنل تھروپ پہلی ہی نظر میں اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ وہ اس کا دیوانہ بن گیا تھا۔ عشق و محبت کی اس داستان کی جزئیات و تفصیلات اور اتار چڑھاؤ کی کفیات سے قطع نظر افسانہ کرنل تھروپ کے قبول اسلام اور جانی سے اس کی باقاعدہ شادی پر منتج ہوا۔

کرنل تھروپ کشمیری دوشیزہ کے عشق میں کیا گرفتار ہوا کہ اس نے سیر و سیاحت کا سلسلہ ترک کر دیا اور شادی کر کے جانی کو اپنے ہمراہ انگلستان لے گیا۔ جانی کے بطن سے ایک ایسے ہیرو نے جنم لیا جس نے کشمیر پر اپنی جان قربانی کر کے وفا کا حق ادا کر دیا۔ یہ لیفٹننٹ رابرٹ تھروپ تھا۔

لیفٹننٹ رابرٹ تھروپ ان کی تیسری اولاد تھا۔ جو رنبیر سنگھ کے عہد میں کشمیر کی سیاحت پر آیا۔ کشمیر سے اس کا تعلق محض سیاح کا نہیں بلکہ کشمیر اس کا ننھیال بھی تھا۔ ماں نے اسے کشمیری گیت لوری میں سنائے ہوں گے۔ کشمیر کی لوک کہانیاں وہ اپنی والدہ سے بچپن میں سن چکا ہوگا۔ کشمیری مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کی داستانیں اس نے اپنے لڑکپن میں اپنی امی کی زبانی سنی ہوں گی۔ سات سمندر پار دیار فرنگ میں کشمیر کی اس بیٹی کو اپنے وطن کی یادیں بے طرح ستاتی رہی ہوں گی۔ اپنے والدین، بہن بھائیوں، قبیلے والوں کی یادیں اسے تڑپاتی رہی ہوں گی اور مغرب کی مصنوعی بہاروں میں وہ کشمیر کی حقیقی بہاروں کو تلاش کرتی رہی ہوگی۔

رابرٹ تھروپ کشمیر کے بارے میں یہ سب کچھ اپنی والدہ سے سنتا رہا ہوگا، اور اس کے لاشعور میں بچپن سے ہی اس خطہ جنت نظیر کی ایک شبیہ بن چکی ہوگی۔ چنانچہ جب وہ عنفوان شباب کو پہنچا تو اپنی اس تصوراتی جنت کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب تھا۔ یہی بے تابی اسے رنبیر سنگھ کے عہد میں کشمیر لے آئی۔

کشمیر میں اسے جو کچھ دیکھنے کو ملا وہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اپنی والدہ کی زبانی وہ کشمیری مسلمانوں پر سکھ حکمرانوں کے مظالم کی داستانیں سن چکا تھا۔ اب جبکہ سکھوں کا عہد جور و جفا قصہ ماضی بن گیا تھا۔ لاہور دربار کی حکومت کا سورج غروب ہو چکا تھا اور ریاست ہی کے ایک باشندے مہاراجہ گلاب سنگھ نے پچھتر لاکھ نانک شاہی کے عوض یہ ریاست انگریزوں سے خرید کر ڈوگرہ راج کی بنیاد ڈال دی تھی۔ لیفٹننٹ رابرٹ تھروپ کی کشمیر آمد کے وقت اس ڈوگرہ خاندان کا دوسرا مہاراجہ رنبیر سنگھ تخت نشین تھا۔ سکھ عہد کا خاتمہ اور ڈوگرہ عہد کا آغاز حقیقت میں کوئی ایسی تبدیلی نہ تھی جسے ریاست کی رعایا بھی محسوس کر سکتی۔ محض حکومت نے چولہ بدلہ تھا۔ ایک تھکے ہوئے جلاد کی جگہ تازہ دم جلاد نے لے لی

تھی۔ ظلم واستبداد میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ رابرٹ تھروپ نے اپنی والدہ سے سکھ عہد کے مظالم کی جو داستانیں سنی تھیں، اب ڈوگرہ عہد میں بھی جور جفا کا وہی اندازہ تھا۔

رابرٹ تھروپ بنیادی طور پر ایک سیاح کی حیثیت سے جنت ارضی کی سیر کرنے کو آیا تھا۔ یہاں آ کر اس نے اس ریاست کے باشندوں کی حالت زار دیکھی تو ایک صحافی کی حیثیت سے ان کی زبوں حالی کی رپورٹیں اور کہانیاں ہندوستانی اور برطانوی اخبارات میں لکھنا شروع کر دیں۔ وہ باقاعدگی سے برطانوی اخبارات وجرائد کو اپنی ڈائری لکھ بھیجتا رہا جس میں ریاستی باشندوں پر ڈوگرہ حکمرانوں کے مظالم کی تفصیلات مہاراجہ کے بدترین اور ظالمانہ انداز حکمرانی کا تذکرہ، عوام کی مفلوک الحالی، غربت اور پسماندگی کی جھلک اور ریاستی انتظامی مشینری کی لوٹ مال کی بھرپور عکاسی ہوتی تھی۔ رابرٹ تھروپ کے مراسلوں سے پہلی بار برطانوی رائے عامہ کو کشمیر کی اصل صورت حال کا علم ہوا۔ ٹنڈل بسکو اپنی کتاب کے صفحہ 234 پر لکھتا ہے:

> ''جلد ہی اس (رابرٹ تھروپ) کا ذہن ایک اہم ترین مسئلہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ یہ ڈوگروں کے بدترین انداز حکمرانی میں کشمیریوں کے مصائب وآلام کا مسئلہ تھا۔ اس نے کسانوں کو دیکھا جو کہ مسلمان تھے۔ اور ان کی رگوں کا خون تک ہندو افسران نچوڑ لیتے تھے۔ فصل وہ اگاتے تھے، اس کا نصف تو حکومت ٹیکس میں وصول کر لیتی تھی اور باقی ماندہ نصف کا نصف ٹیکس وصول کرنے والا عملہ رشوت میں ہتھیا لیتا تھا۔ یوں غریب کشمیری کسانوں کے پاس بمشکل چوتھائی حصہ بچتا تھا۔ جس سے وہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے پر مجبور تھے''

لیفٹیننٹ رابرٹ تھروپ کشمیر کے طول وعرض میں گھومتا رہا۔ وہ گاؤں گاؤں جاتا

اور لوگوں کی حالت زار کا بچشم خود مشاہدہ کرتا تھا۔ پھر باقاعدگی سے برطانوی حکومت کے مختلف اداروں، رائے عامہ سے متعلق شخصیات اور برطانوی اخبارات میں اس کی تفصیل لکھ بھیجتا۔ چنانچہ اس کے مراسلوں نے برطانوی حکومت اور رائے عامہ کو کشمیر کی طرف سنجیدگی سے متوجہ کر دیا۔

رابرٹ تھروپ کا حق گوئی اور بے باکی کا یہ جرم کوئی ایسا جرم نہ تھا جسے ڈوگرہ حکومت آسانی سے برداشت کر لیتی۔ چنانچہ اسے فوری طور پر کشمیر سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ جیسا کہ ٹنڈل بسکو نے اپنی محولہ بالا کتاب کے صفحہ نمبر 239 پر لکھا ہے:

''بہر حال اس (رابرٹ تھروپ) پر مشکل وقت آ پہنچا اور اس کو ریاست بدری کا حکم دیا گیا جسے اس نے ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر اسے اس کے کمرے میں نظر بند کر دیا گیا اور اس پر جاسوس مقرر کر دیئے گئے جو اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے۔ اگرچہ اس نے بچ نکلنے کا اہتمام کیا اور واپس سری نگر آ گیا لیکن بے سود، دوسری صبح اسے ناشتے میں زہر ملا کر دے دیا گیا، جس سے اس کی فوری طور پر موت واقع ہوگئی''۔

کشمیریوں کا یہ مونس و غم خوار .... ان کا بے باک ترجمان .... کشمیری ماں کے دودھ کے ایک ایک قطرے کا حق ادا کرنے والا یہ بطل حریت 22 نومبر 1868ء کو اس جنت ارضی پر قربان ہو گیا۔ رابرٹ تھروپ وہ پہلا غیر کشمیری باشندہ ہے جس نے کشمیریوں کی حالت زار کو یوں شرح و بسط سے بیان کیا اور اسی پاداش میں جامِ شہادت نوش کیا۔ اگرچہ اسے مکمل طور پر غیر کشمیری قرار نہیں دیا جا سکتا کہ کشمیر کے ساتھ اس کا تعلق ننھیال کا تھا اور اس اعتبار سے کشمیر اس کا اپنا گھر بھی تھا۔ .... کشمیریوں کا یہ محسن شیخ باغ سری نگر میں چنار کے ایک گھنے درخت کے نیچے آسودہ خاک ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقاں پاک طینت را

۱۵

سری نگر میں یورپی خفتگان خاک

کشمیر جنت نظیر پر برطانوی راج کی عملداری ولیم مور کرافٹ اور وکٹر ژاک مونٹ سمیت اکثر مغربی اور یورپی سیاحوں کی خواہش رہی ہے۔ وہ ہندوستان میں مقیم برطانوی باشندوں کے لیے اس وادی گلپوش کو دوسرا انگلینڈ بنانا چاہتے تھے تاکہ موسم گرما میں ہندوستان کی جھلسا دینے والی گرمی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکار اور حکام یہاں کی فرحت بخش اور خنک ہواؤں سے لطف اندوز ہوسکیں۔ عین اس وقت جبکہ ان یورپی سیاحوں کی دعائیں قبولیت سے ہمکنار ہونے کو تھیں، خود برطانوی حکام نے اس جنت عرضی کو اپنے ہاتھوں سے گنوا دیا۔ ہوا یوں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے درمیان جنگ سکھوں کی شکست اور حکومت برطانیہ کی فتح پر منتج ہوئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو تاوان جنگ کے طور پر بھاری رقم اور جموں وکشمیر کی پوری ریاست حکومت برطانیہ کو دینی پڑی۔ اس جنگ نے برطانیہ کو اقتصادی طور پر شدید نقصان پہنچایا تھا۔ لہذا انہیں سرزمین کشمیر سے زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔ ادھر سکھ فوج کے سالار گلاب سنگھ نے بھی اس جنگ میں اپنے محسن رنجیت سنگھ کے ساتھ غداری کرتے ہوئے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اور یوں ا نہیں فتح سے ہمکنار کیا تھا۔ لہذا اس غداری کا صلہ بھی وہ انگریزوں سے حاصل کرنا چاہتا

تھا۔ یوں 1846ء میں گلاب سنگھ اور حکومت برطانیہ کے درمیان امرتسر کے مقام پر ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے انگریزوں نے پچھتر لاکھ نانک شاہی کے عوض پوری ریاست گلاب سنگھ کے حوالے کر دی۔ اس سیاہ ترین دستاویز کو تاریخ میں ''معاہدہ امرتسر'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اس معاہدہ کے بارے میں کہا تھا۔

بادِ صبا بہ جنیوا گزر گنی
حرفِ زما بہ مجلسِ اقوام باز گوئی
دہقان وکشت وجوئے وخیابان فروختند
قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

''اے صبح کی ٹھنڈی ہوا!
اگر تیرا گزر جنیوا سے ہو تو مجلس اقوام کو میرا یہ پیغام دے دینا کہ قدرناشناس انگریزوں نے کشمیر جیسا جنتِ نظیر خطہ کسانوں، کھیتوں، نہروں اور باغوں سمیت بیچ ڈالا ہے۔ ایک پوری قوم بیچ دی ہے اور غضب یہ کہ کتنی سستی بیچی ہے۔''

اس بدنام زمانہ معاہدہ امرتسر کا نتیجہ ماسوائے اس کے کچھ برآمد نہ ہوا کہ بدقسمت کشمیریوں پر سکھوں کا عہد ستم ختم ہوا تو ڈوگروں کا دور ظلم و جفا شروع ہو گیا۔ تھکے ہوئے جلادوں کی جگہ تازہ دم جلادوں نے لے لی اور بدقسمت کشمیری اگلی ایک صدی کے لیے ڈوگرہ دور کے ظلم واستبداد کے اندھیروں میں دھکیل دیے گئے۔ انگریزوں کی بنیا ذہنیت نے اس جنت ارضی کو جنس کاروبار سمجھ کر فروخت کر ڈالا تھا۔

بڑھتا ہوا برطانوی اثر ورسوخ

اگرچہ مورکرافٹ، ژاک مونٹ اور دوسرے مغربی سیاحوں کی خواہش کے

مطابق کشمیر براہ راست تاج برطانیہ کی مکمل عملداری میں نہ آسکا لیکن سکھوں کی حکومت کے خاتمے اور ڈوگرہ راج کے قیام کے ساتھ ہی انگریزوں کے لیے کشمیر کی آمدورفت میں حائل رکاوٹیں دور ہوگییں۔ بڑی تعداد میں انگریز مہاراجہ گلاب سنگھ کی فوج اور انتظامیہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوگئے اس کے ساتھ ہی یورپ کی وادیوں کی ہم پلہ اس وادی میں سیاحتی سرگرمیاں بھی تیز تر ہوگئیں۔

کشمیر میں عیسائیت کی تبلیغ مسیحی مشنریوں کا دیرینہ خواب رہا ہے جس کی تعبیر کے لیے سولھویں اور سترھویں صدی ہی سے پادریوں نے یہاں تبلیغ کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ پرتگیزی پادریوں ژاویر اور ڈی گوز سے لے کر ڈی سدری تک مسیحی مشنریوں نے یہاں اپنے عقائد کا پرچار کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اب بدلے ہوئے حالات میں برطانوی مسیحی مشنریوں کو اپنے اس دیرینہ خواب کی تعبیر کے لیے قسمت آزمائی کرنا تھی۔ چنانچہ متعدد مشنری ادارے، مشن سکول اور مشن ہسپتال سری نگر میں قائم ہوگئے۔ اس طرح سری نگر میں دو اور گلمرگ میں ایک چرچ بھی بنا اور عیسائی مشن نئے عزم کے ساتھ مسیحیت کے فروغ میں منہمک ہوگئے۔

ادھر ڈوگرہ حکومت نے بھی برطانوی باشندوں کی روز افزوں بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر سیاحت کی خصوصی طور پر حوصلہ افزائی کی۔ مشنریوں اور سیاحوں کے سفر کو محفوظ اور قیام کو پرسکون بنانے کے لیے خاص انتظامات کیے۔

منشی باغ

قبل ازیں برطانوی باشندوں کو دلاور خان کے باغ میں ٹھہرایا جاتا تھا لیکن اب سیاحوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر مہاراجہ گلاب سنگھ نے دریائے جہلم کے کنارے منشی باغ اور شیخ باغ میں سیاحوں کے لیے قیام گاہیں تعمیر کرائیں۔ یورپی باشندوں کی ضرورت

کے پیش نظر منشی باغ میں بہت سے ریسٹ ہاؤس بنائے گئے۔ اسی عرصے میں برطانوی مشنریوں نے بھی کشمیر پر یلغار کردی تھی۔ ان کے پادری، مشن سکولوں اور مشن ہسپتالوں کا عملہ بھی یہیں قیام پزیر تھا۔ برطانوی ریزیڈنٹ کا تقرر بھی اسی دور میں ہوا اور بعدازاں ریزیڈنسی کی عمارت بھی تعمیر ہوگئی۔ یہ عمارت بھی منشی باغ ہی کے گوشے میں بنائی گئی تھی جو 1885ء کے زلزلے میں منہدم ہوگئی تھی۔ بعدازاں اسے نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔ آج کل ریزیڈنسی کی عمارت میں کشمیر ہینڈی کرافٹس ایمپوریم قائم کیا گیا ہے۔ ریزیڈنسی کے ساتھ ہی برطانوی باشندوں کی تفریح طبع اور Get together کے لیے کلب تعمیر کیا گیا تھا۔ اسی طرح اس دور کا عیسائی مشن ہسپتال اب سرکاری تحویل میں ٹی بی ہسپتال کے طور پر کام کر رہا ہے۔ یہ سارا علاقہ منشی باغ کا علاقہ تھا جو اب سری نگر کا قدیم ترین اور گنجان آباد علاقہ ہے۔

یہ علاقہ کسی دور میں ایک چھوٹے سے برطانیہ کا منظر پیش کرتا تھا، جہاں سول اور فوجی حکام، مسیحی مبغلین، معلمین اور مدرسین کی قیام گاہیں، کلب، ریزیڈنسی، مشن ہسپتال، بینک، سکول اور پوسٹ آفس وغیرہ قائم تھے۔ منشی باغ کے عقب میں پولو گراؤنڈ، ٹینس اور ہاکی کے گراؤنڈ تھے اور ان کے پس منظر میں 1900ء میں نیڈوز ہوٹل تعمیر ہوا۔ اگرچہ کشمیر براہ راست برطانیہ کی علمداری میں نہیں رہا تاہم برطانوی عہد کے نشانات ہنوز اس پرانے سری نگر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

شیخ باغ

گلاب سنگھ کے تعمیر کردہ دوسرے باغ، شیخ باغ میں عیسائیوں کے لیے قبرستان بھی بنایا گیا تھا۔ اس میں سب سے پہلی قبر ہندوستان میں تعینات برطانوی فوج کی نویں رائفلز رجمنٹ کے کرنل کی ہے جو 1850ء میں کشمیر میں دوران سفر کسی حادثے میں ہلاک ہوا۔ کشمیری مسلمانوں کی مظلومیت کی تصویر پہلی بار دنیا کو دکھانے والا رابرٹ تھروپ بھی

یہیں چنار کے ایک درخت کی چھاؤں میں آسودہ خاک ہے جسے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں 22 نومبر 1868ء کو تحت سلیمان میں زہر دے کر ہلاک کیا گیا۔ 19 اکتوبر 1877ء برطانوی فوج کی چوتھی رائفلز بٹالین لیفٹینینٹ رابرٹ لائیڈ ایڈورڈز (Robert Llioyed Edwards) بانڈی پورہ کے قریب ایک پہاڑی کھائی سے گر کر ہلاک ہوا۔ اسے بھی اپنے پیشرو کرنل کے پہلو میں شیخ باغ سری نگر میں ہی سپرد خاک کیا گیا۔ پندرھویں بنگال رجمنٹ کے کرنل سڈنی ڈرمنڈ ٹرن بل Sidney Durammond Turnbull سیاحت کشمیر کے دوران ایک چیتے کے ساتھ جھڑپ میں ہلاک ہوا۔ اس کی قبر بھی شیخ باغ میں ہی ہے۔ اسی قبرستان میں کئی عیسائی پادریوں، مشن سکولوں کے استادوں اور استانیوں، مشن ہسپتالوں کے عملے، سیاحوں اور دوسرے برطانوی اور یورپی باشندوں کی قبریں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ شیخ باغ ہی میں اہم سیاحوں اور خاص برطانوی مہمانوں کے لیے قیام گاہ میں بھی تعمیر کی گئیں تھی۔ عیسائی قبرستان کے پہلو میں ہی ''ہیلٹن کاٹیج'' کی عمارت ایستادہ تھی جس میں چرچ مشن سوسائٹی کے زیر اہتمام چلنے والے مشن سکول کا پرنسپل ٹنڈل بسکو نصف صدی تک مقیم رہا۔ بسکو نے نصف صدی کشمیر میں کیا کیا انقلاب دیکھے؟ اس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔

چنار باغ

شیخ باغ اور منشی باغ کے علاوہ برطانوی باشندوں کے لیے ایک اور باغ بھی مختص کیا گیا تھا اور وہ تھا ''چنار باغ'' یہ باغ نیڈوز ہوٹل کے عقب میں تھا اور یہاں صرف غیر شادی شدہ برطانوی نوجوان سیاحوں اور کارکنوں کو ٹھہرنے کی اجازت تھی۔ گویا شادی شدہ عیسائی جوڑوں کے لیے منشی باغ، غیر شادی شدہ نوجوانوں کے لیے چنار باغ اور وفات پا جانے والے یورپی باشندوں کے لیے بلا تخصیص جنس و عمر، شیخ باغ مختص کیا گیا

تھا۔ایک انگریز خاتون سیاح پاربری (Miss Parbury) جس نے 1902ء میں کشمیر کی سیاحت کی، چنار باغ دیکھنے کی بہت متمنی تھی لیکن ریاستی حکومت کی طرف سے خواتین کو اس طرف آنے کی اجازت نہ تھی۔ مغرب کی یہ آزاد مشن خاتون ریاستی حکومت کی طرف سے عائد کردہ پابندی پر بہت چیں بہ جبیں ہوئی، بالآخر جل بھن کر لکھتی ہے:

''ایک اور خوبصورت اور سایہ دار باغ جس کا نام چنار باغ ہے، سیاحوں کے لیے شائع کیے گئے ہدایت نامہ کے مطابق یہ باغ صرف غیر شادی شدہ مرد حضرات کے لیے مختص ہے اور کوئی خاتوں ادھر نہیں آسکتی اور نہ اس سے ملحق دریا میں اپنی کشتی لنگر انداز کرسکتی ہے۔ اس سے شاید یہ بات ثابت کرنا مطلوب ہے کہ یہاں مقیم برطانوی مرد نوجوان کتنے خودغرض اور غیر مہذب ہیں۔''

کشمیر میں مشنریوں کی سرگرمیاں

بدلے ہوئے حالات سے فائدہ اٹھانے کی نئی حکمت عملی کے تحت انگلستان کی کرسچن مشنری سوسائٹی نے جس شخص کو سب سے پہلے کشمیر بھیجا وہ سکاٹ لینڈ کا ایک مشنری ڈاکٹر (Villiam Elmslie) تھا۔ وہ 1865ء میں سری نگر آیا اور ایک مسیحا کے روپ میں بھولے بھالے اور مفلوک الحال کشمیریوں کو مسیحیت کی طرف راغب کرنے کا فریضہ سرانجام دینے لگا۔ ڈاکٹر ایلمسلے ایک عیسائی مبلغ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک درددل رکھنے والا معالج اور ہمدرد انسان بھی تھا۔ اس نے اپنی زندگی وادی کشمیر میں اپنے مشن کے لیے وقف کر دی تھی۔ دن رات محنت سے اس کی طبیعت بگڑتی چلی گئی۔ لیکن اس نے اپنی سرگرمی جانفشانی سے جاری رکھی۔ اپنی وفات سے قبل ایک ماہ میں اس نے گیارہ سو مریضوں کا علاج کیا اور ستر اپریشن کیے۔ ڈاکٹر ایلمسلے کو بھی بالآخر شیخ باغ کے عیسائی قبرستان میں دفن کردیا گیا۔

ایلمسلے کی وفات کے بعد کرسچن مشنری سوسائٹی نے ایک خاتون ڈاکٹر فینی بٹلر کو وادی کشمیر بھیجا۔ فینی بٹلر نے اس سے پہلے لندن سکول آف میڈیسن فار ویمن سے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی تھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اسے ہندوستان میں طبی اور مشنری خدمات کی انجام دہی کے لیے تعینات کیا گیا جہاں وہ چھ سال تک اپنے فرائض سرانجام دیتی رہی۔ 1888ء میں اسے کشمیر جانے کا حکم ملا اور یوں اس نے ڈاکٹر ایلمسلے کے ادھورے مشن کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔

ڈاکٹر فینی بٹلر نے سری نگر میں خواتین کے علاج معالجہ کے لیے ایک باقاعدہ کلینک کھول دیا۔ ایک سال میں اس نے تقریباً پانچ ہزار مریضوں کا علاج کیا۔ اور بالآخر وہ بھی اپنے پیشرو ڈاکٹر ایلمسلے کی طرح زندگی کی بازی ہار گئی۔

فینی بٹلر کی رحلت کے پانچ سال بعد ایک نوجوان عیسائی دوشیزہ مسیحی مشنری بن کر کشمیر آئی۔ یہ بیس سالہ عیسائی راہبہ آئرینی پیٹری (Miss Irenie Petrie) تھی۔ وہ سری نگر کے مشن سکول میں ایک معلّمہ کی حیثیت سے تعینات ہوئی تھی۔ سکول میں تدریس کے علاوہ سری نگر میں گھر گھر گھوم پھر کر کشمیریوں کو بائبل کی تعلیم بھی دیتی تھی۔ مشنری جذبے سے سرشار یہ جواں سال مبلغہ خوش شکل تو تھی ہی، قدرت نے اسے غضب کا خوش الحان بھی بنایا تھا۔ وہ کشمیری خواتین میں جلد گھل مل جاتی، عیسائیت کی طرف انہیں مائل کرنے کے لیے اپنی دعوت پر مبنی نغمے گا کر انہیں مسحور کرتی، انہیں کھانے پکانے اور سلائی کڑھائی کی تربیت دیتی اور ساتھ ساتھ اپنی تبلیغی سرگرمیاں بھی جاری رکھتی۔ اس طرح وہ سری نگر کی خواتین میں تھوڑے ہی عرصے میں ہردلعزیز ہوگئی۔

مسز پیٹری شیخ باغ میں واقع ہلٹن کاٹیج میں ٹنڈل بسکو اور اس کی اہلیہ کے ہمراہ اقامت گزیں تھی (ٹنڈل بسکو کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا) یہی ہلٹن کاٹیج اس کی اور اس کے

میزبان ٹنڈل بسکو کی مشنری سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ تبلیغی سرگرمیوں کے علاوہ سری نگر میں مقیم برطانوی باشندوں کی خبر گیری کرنا اور اس دیارِ غیر میں ان کی ضرورتوں، آرام اور سہولت کا خیال رکھنا بھی اس کا گویا فرض منصبی تھا۔ وہ ہر طرح سے اپنے ہموطنوں کی دلجوئی کی کوشش کرتی۔

1896ء میں بشپ آف لاہور بشپ میتھیو کشمیر کے دورے پر آیا۔ مس پیٹری اور دیگر مسیحی مشنریوں نے اس کا شایانِ شان استقبال کیا اور لندن کی چرچ سوسائٹی کے زیرِ اہتمام تعمیر شدہ چرچوں کا دورہ کیا۔ ان میں سے دو چرچ سری نگر میں تھے جبکہ تیسرا **گلمرگ** میں۔ اس موقع پر مذہبی تقریبات کے انعقاد میں مس پیٹری نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

جون 1897ء میں ملکہ وکٹوریہ کی تاج پوشی کی ڈائمنڈ جوبلی تقریبات منعقد کی گئیں۔ سری نگر میں مقیم برطانوی باشندوں نے خصوصی جوش و خروش سے ان تقریبات کا انعقاد کیا۔ مہاراجہ کشمیر بھی اس موقع پر برطانوی حکومت کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ اس نے بھی ان تقریبات کی خصوصی سرپرستی کی۔ مہاراجہ کی طرف سے ریزیڈنسی گارڈن میں خصوصی دربار منعقد کیا گیا۔ فوجی پریڈ بھی منعقد کی گئی۔ مس پیٹری ان تقریبات کی بھی روح رواں تھی۔ تقریبات کے اختتام کے ایک ہفتہ بعد وہ سیر و تفریح کے لیے لداخ کے سفر پر نکل گئی جہاں لیہ میں وہ ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو کر چند ہی روز میں جان سے گزر گئی۔ اتفاق سے معروف برطانوی معالج ڈاکٹر آرتھر نیو (Arther Neve) بھی ان دنوں لیہہ میں موجود تھا۔ پیٹری کی بیماری سن کر وہ بھاگا اس کے پاس آ پہنچا اس کو بچانے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

یہ نوجوان راہبہ ڈاکٹر آرتھر نیو کی تمام تر تگ و دو کے باوجود جانبر نہ ہوسکی اور اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئی اسے لیہہ میں ہی دفن کیا گیا۔

ڈاکٹر آرتھر نیو بھی کشمیر میں عیسائی مشنری سرگرمیوں کا ایک اہم کردار ہے۔ اس نے ایڈنبرگ سے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی تھی۔ دریں اثناء اس نے مشہور مسیحی مشنری ڈاکٹر لیونگ سٹون کی مشنری خدمت کا تذکرہ پڑھا جس سے وہ بے حد متاثر ہوا اور اس نے اپنی زندگی عیسائی مشن کی ترویج اور دکھی انسانیت کی خدمات کے لیے وقف کرنے کا اٹل فیصلہ کرلیا۔ اس کی خواہش افریقہ میں خدمات انجام دینے کی تھی لیکن اس دور کی لندن کی چرچ مشن سوسائٹی کی کشمیر پر خصوصی نظر کرم سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کشمیر کے مجبور و مظلوم، بے کس بے بس اور مفلوک الحال باشندوں کو انسانی ہمدردی اور طبی اور تعلیمی خدمات کے ذریعے "مشرف بہ مسیحیت" کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر آرتھر نیو کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب چرچ مشن سوسائٹی نے اسے اس کی خواہش کے برعکس کشمیر میں مشنری خدمات کی انجام دہی کے لیے مامور کر دیا۔

1882ء میں وہ اپنے دل پر جبر کر کے عازم کشمیر ہوا۔ دوران سفر قدم قدم پر اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر اس نے پنجاب سے براستہ جہلم ویلی، کشمیر کا سفر اختیار کیا۔ ہانپتا کانپتا، گرتا پڑتا، سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا آرتھر نیو جب بارہ مولا کے قریب دریائے جہلم کے کنارے پہاڑ کے اس بلند مقام پر پہنچا جہاں سے وادی کشمیر ہتھیلی کی طرح سامنے پھیلی نظر آتی تھی۔ اتنی خوبصورت، وسیع و عریض، ہری بھری اور دیومالائی حُسن کی حامل وادی کو اپنے سامنے پا کر اس کے سفر کی ساری کلفتیں دور ہو گئیں۔ اس کی تھکن راحت میں اور غصہ شرمساری میں بدل گیا۔ اس کے سامنے حد نظر تک پھیلی ہوئی وادی......... ہاں یہی وادی کشمیر تھی جو اس کے تصور......... اس کے وہم و گمان اور اس کے خواب و خیال سے بڑھ کر حسین تھی.........

آرتھر نیو کشمیر کے حُسن کا اس قدر اسیر ہوا کہ اس نے اپنی زندگی کے اگلے چالیس

سال اس وادی جنت نظیر میں گزارے۔اس کا بھائی ارنسٹ (Arnest) بھی جلد ہی اس کے پاس چلا آیا اور دونوں بھائیوں نے سرینگر کے مشن ہسپتال میں طبی خدمات انجام دینا شروع کردیں۔اگرچہ ایک ڈاکٹر اور ایک مسیحی مشنری کی حیثیت سے آرتھر نیو کا زیادہ تر وقت اپنی طبی اور تبلیغی سرگرمیوں میں گزرتا تھا اور سیر وتفریح جیسے مشاغل کے لیے اس کے پاس بہت کم وقت بچتا تھا۔تاہم جیسے ہی اسے فرصت کے لمحات میسر آتے وہ ریاست کے اطراف واکناف میں سیر وسیاحت کی غرض سے نکل جاتا اور فطرت کی فیاضی اور حُسن کائنات کی رنگارنگی سے قلب وروح کو معطر کرتا تھا۔اس نے لداخ اور سکردو کا بھی سفر کیا اور جموں اور کشتواڑ کا بھی۔اس نے سیاحوں کی راہنمائی کے لیے کشمیر پر ایک ٹورسٹ گائیڈ بک بعنوان The Tourist guide to Kashmir بھی لکھی۔اس نے اپنی اس کتاب میں کشمیر کے صحت افزاء مقامات، شہروں، جھیلوں، چشموں، دریاؤں، باغوں، موسموں، پھولوں، سبزیوں، سڑکوں اور پیدل راستوں کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کیں۔اگرچہ 1947ء میں ریاست جموں وکشمیر کی تقسیم کے نتیجہ میں آمدورفت کے بعض راستے مسدود ہوگئے تاہم اس کی دی ہوئی اکثر معلومات اب بھی سیاحت کشمیر کے سلسلے میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔اس کے بیان کردہ اکثر راستے اب بھی اہلِ کشمیر کے زیرِ استعمال ہیں۔بعض پر تو بعد میں سڑکیں اور شاہرائیں بھی تعمیر ہوئیں۔

۱۶

ایک آبلہ پا وادی پرخار میں

مسز ہاروے

1850ء میں سیاحت کشمیر کے حوالے سے ایک اور رومانوی داستان نے جنم لیا جو ایک عرصہ تک برطانیہ اور برصغیر میں مقیم برطانوی افسروں کی گفتگوؤں کا عنوان رہی۔ یہ مسز ہاروے کی المیہ داستان ہے۔ مسز ہاروے کی ذاتی زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کہ وہ غیر معمولی طور پر دلیر اور مہم جو طبیعت کی مالک ایک برطانوی خاتون تھی۔ وکٹر ژاک مونٹ اور چارلس ہیوگل کے برعکس مسز ہاروے کی شادی اس کے خوابوں کے شہزادے سے ہوگئی تھی۔ لیکن اس کی محبت کا یہ خوشگوار آغاز ایک ناخوشگوار انجام میں تبدیل ہوگیا۔ اس کا شوہر ایک فوجی افسر تھا۔ وہ اپنی سیماب صفت اور فنکارانہ مزاج کی حامل بیوی کو بھی فوجی قواعد وضوابط کی رسی میں کس کر رکھنا چاہتا تھا اور بیوی اس قدر فوجی نظم وضبط کے بندھنوں میں کس کر رہنے کو تیار نہ تھی۔ یہی وجہ ہے مسز ہاروے فوجی افسر کی بیوی ہونے کو Galley Saves کا نام دیتی ہے۔ شوہر سے اس کا نباہ نہ ہوسکا اور اس کی گھریلو زندگی عذاب بن کر رہ گئی۔ اسی عذاب سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے کشمیر، تبت اور دوسرے مشرقی ممالک کا سفر اختیار کیا۔

اگرچہ اس داستان کا مرکزی کردار بدقسمت مسز ہاروے ہی ہے لیکن ہنوریا لارنس (Hanoria Lawarance) بھی اس کہانی کی اہم کردار ہے جو سر ہنری لارنس کی بیوی تھی ۔سر ہنری لارنس اس وقت پنجاب میں برطانوی انتظامیہ کا سربراہ اور پنجاب کا بے تاج بادشاہ تھا۔مہاراجہ گلاب سنگھ اور حکومت برطانیہ کے درمیان ہونے والے بدنام زمانہ معاہدہ امرتسر میں حکومت برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے اس کا بنیادی کردار تھا۔کشمیر کے مہاراجہ گلاب سنگھ کے حوالے کرنے کے بعد سر ہنری لارنس نے گلاب سنگھ کو کچھ انتظامی مشورے دینے اور ریاست میں امن وامان کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے 1850ء میں اپنی اہلیہ ہنوریا لارنس اور اپنے بچوں ہیری (Harry) اور ہنی (Heny) کے ساتھ کشمیر کا سفر کیا۔وہ سری نگر میں شیخ باغ میں واقع مہاراجہ گلاب سنگھ کے گیسٹ ہاؤس میں مقیم تھے۔سر ہنری لارنس اپنی سرکاری اور اس کی بیوی اور بچے نجی سرگرمیوں میں مصروف تھے کہ سر ہنری لارنس کو اپنے بیوی بچوں کو سری نگر میں ہی چھوڑ کر کچھ عرصہ کے لیے لداخ جانا پڑا۔راستے میں اس کی ملاقات دراس کے مقام پر مسز ہاروے سے ہوئی جو لیہ سے سری نگر کی جانب آ رہی تھی جبکہ سر ہنری لارنس سری نگر سے لیہہ کی جانب رواں دواں تھے۔

کیپٹن سے ملاقات

مسز ہاروے نے اپنا بیشتر سفر تنہا جاری رکھا تاہم راستے میں کولو کے مقام پر اس کی ملاقات ایک اور فوجی افسر سے ہوئی جسے اس نے کیپٹن ایچ (Captain H) کا نام دیا ہے۔یہ افسر وہاں اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے تعینات تھا۔اس نے مسز ہاروے سے اظہار ہمدردی کیا اور اسے ان خطرات سے آگاہ کیا جو ایک اجنبی عورت کو دشوار گزار علاقے میں تنہا سفر کے دوران پیش آ سکتے ہیں۔اس نے مسز ہاروے کو پیش کش کی کہ وہ اسے اپنا ہم

سفر بنالے تاکہ وہ دوران سفر اس کی ضروریات کی تکمیل اور تحفظ کی ذمہ داری نبھا سکے۔ وہ تنہا سفر اور راستے کی مشکلات سے چنداں خوفزدہ نہ تھی لیکن اس کے ہمدردانہ لب و لہجے میں محبت بھری پیشکش کو ٹھکرا نہ سکی اور اسے اپنا ہمسفر بنالیا۔ یہاں سے اس کی مشکلات اور مسائل کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا'' کے مصداق وہ اپنے فوجی شوہر سے جان چھڑا کر سکون کی تلاش میں ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں اور وادیوں میں نکلی تھی لیکن یہاں اسے ایک اور فوجی افسر سے پالا پڑ گیا تھا۔

دونوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ دراس میں جب سر ہنری لارنس سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس وقت Captain H اس کا ہمسفر تھا۔ اگر چہ ان دونوں کا اپنا اپنا سامان سفر تھا اور اپنے اپنے ملازم تھے، جوان کا سامان اٹھائے ہوئے تھے لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ عین اس دن جب ان کی ملاقات اچانک ہنری لارنس سے ہوئی، دونوں ایک ہی خیمے میں مقیم تھے۔ ایک نوجوان شادی شدہ انگریز خاتون کی ایک اجنبی کے ساتھ اس درجہ قربت پر سر ہنری لارنس کو سخت غصہ آیا اس نے Captain H کے افسر بالا کو اس کی سرگرمیوں کے بارے میں جو رپورٹ بھیجی اس میں اس نے لکھا:

> "The Night before we met...She had a bed and he had none, and they had only one tent up.The same thing would have happened last night,have we not given them shelter".

سر ہنری لارنس کی اس رپورٹ پر Captain H کے خلاف کیا کارروائی ہوئی، اس کا تو کچھ علم نہیں البتہ اتنا معلوم ہے کہ کیپٹن ایچ (Captain H) نے مسز ہاروے کے ہمراہ سفر جاری رکھا۔ دراس میں مسز ہاروے نے سر لارنس سے وادی میں جھیل ولر کی سیر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور سر ہنری لارنس نے اسے کشتی کے ذریعے جھیل

مانسبل سے ہوتے ہوئے جھیل ولراور وہاں سے براستہ دریائے جہلم سرینگر پہنچنے کا راستہ سمجھایا تھا۔

مچھروں کی یورش

یہ اگست کا مہینہ تھا اور وادی کشمیر پر مچھروں کی یورش تھی۔ اس دور میں کشمیر کی سیاحت کے لیے اگست بدترین مہینہ تصور ہوتا تھا۔ جھیل مانسبل کے کنارے ایک بوسیدہ سی عمارت میں انھوں نے پہلی رات مچھروں کے پے در پے حملوں کے باعث جاگ کر گزاری۔ اگلے دن مسز ہاروے نے کشتی کرائے پر لی اور جھیل ولر کی سطح آب سے نشاط باغ کے اس حصے میں منتقل ہوگئی جو خواتین کے لیے مختص تھا۔ کیپٹن ایچ بھی اسی باغ میں قیام پذیر تھا۔ شام کو دونوں اکٹھے شالیمار باغ کی سیر کو نکل جاتے۔ شالیمار باغ تھامس مور کی نظم ''لالہ رخ'' کی وجہ سے پہلے سے ہی ان کے قلب ونگاہ میں سمایا ہوا تھا۔ اگر چہ شالیمار باغ میں بھی اکادکا مچھروں نے انہیں تنگ کیا لیکن پھر بھی خیر گزری کہ شالیمار کی رومان پرور فضاؤں سے وہ خوب لطف اندوز ہوئے۔ مسز ہاروے لکھتی ہیں:

''شالیمار باغ کا محل اگرچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے لیکن باغ اب بھی بہت خوبصورت ہے۔ باغ کے فوارے ہمارے استقبال میں رقصاں ہیں۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں محل کے مرمریں ستونوں پر قوس قزح کے رنگ بکھیر رہی ہیں۔ شالیمار باغ کی خوبصورتی نے میرا دل موہ لیا ہے۔''

دوسرے دن مسز ہاروے کو محسوس ہوا کہ نشاط باغ شہر سے دور ہے لہذا اس نے یہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ معلوم نہیں مسز ہاروے نے نشاط باغ چھوڑنے کا فیصلہ واقعی دوری کی وجہ سے کیا تھا یا کیپٹن ایچ کی بڑھتی ہوئی بے تکلفی سے وہ اکتا گئی تھی۔ تاہم شالیمار باغ سے اس کا جانا ٹھہر گیا تھا۔ شیخ باغ جہاں سر ہنری لارنس کی اہلیہ اپنے بچوں سمیت مقیم تھیں میں کوئی

مکان اب خالی نہیں تھا۔ جس میں مسز ہاروے منتقل ہوسکتی۔ تلاش بسیار کے بعد منشی باغ سے ملحق دریائے جہلم پر ایک ہاؤس بوٹ کرائے پر لی اور مسز ہاروے اس میں منتقل ہوگئی۔

پُراسرار طرزِ عمل

اس عرصہ میں مسز ہاروے اور کیپٹن ایچ کے تعلقات کی نوعیت کیا رہی؟ مسز ہاروے کی تحریروں سے اس کی تفصیل نہیں ملتی البتہ سر ہنری لارنس کی اہلیہ لیڈی لارنس کی تحریروں سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ وہ یوں کہ چند دنوں کے بعد لیڈی لارنس کو مسز ہاروے کا ایک خط ملا جس میں تحریر تھا کہ وہ منشی باغ کے اس ہاؤس بوٹ میں اپنے آپ کو غیر محفوظ خیال کرتی ہے۔ کیونکہ کیپٹن ایچ اس کی جان اور "عزت" کے درپے ہے اور اسے مسلسل پریشان کیا جارہا ہے۔ لہذا اس کے لیے مناسب قیام کا بندوبست کیا جائے۔ ہنوریا لارنس نے اس کے جواب میں اس کی حوصلہ افزائی کی اور لکھا کہ وہ اسے اپنی بچی سمجھتی ہے اور اس کی حفاظت اور قیام طعام کی پوری طرح ذمہ داری قبول کرنے پر تیار ہے۔ لہذا وہ وہاں سے شیخ باغ میں اس کی رہائش گاہ پر منتقل ہوجائے۔ مسز ہاروے نے اس کے جواب میں چپ سادھ لی اور چند دن کے بعد اسی مضمون کا ایک اور نوٹ ہنوریا لارنس کو دوبارہ بھیجا جس میں گزشتہ تاخیر کی معذرت اور آئندہ کے لیے اس سے امان طلب کی گئی تھی۔ جواب میں مسز لارنس نے پہلے سے بھی زیادہ اصرار کے ساتھ اپنی شفقت دہرائی۔ لیکن حسبِ سابق اس مرتبہ پھر مسز ہاروے نے خاموشی اختیار کرلی۔ چند دن کے بعد پھر اپنی پریشانیوں کا رونا روکر اس کے ہاں منتقل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اب مسز لارنس نے اپنے ملازموں کو بھیجا کہ اس کا سامان وہاں سے اٹھا کر اس کے ہمراہ اس کی رہائش گاہ پر لائیں۔ ملازمین کے جانے پر مسز ہاروے نے پھر معذرت کرلی اور کہا کہ اس نے اب سری نگر سے چلے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اگلی صبح وہ سری نگر سے روانہ ہوگئی۔ مسز ہاروے کے ساتھ ہونے

والی یہ ساری خط وکتابت ماوڈ ڈائیور (Maud Diver) کی لکھی ہوئی ہنوریا لارنس کی سوانح عمری میں موجود ہے جو 1936ء میں برطانیہ سے شائع ہوئی جبکہ دوسری طرف مسز ہاروے اپنے جریدے میں لکھتی ہیں کہ اس نے میڈم ہنوریا لارنس کی دعوت پر منشی باغ چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ شیخ باغ منتقل ہوگئی البتہ اس نے کیپٹن سے ہونے والی نوک جھونک کا ذکر گول کر دیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسز ہاروے نے ایسا پراسرار طرز عمل اختیار کیوں کیا کہ وہ بار بار ہنوریا لارنس سے مدد کی التجا بھی کرتی ہے۔ اور اس کی طرف سے مشفقانہ پیش کش پر چپ بھی سادھ لیتی ہے۔ ممکن ہے کہ منشی باغ میں مسز ہاروے اور کیپٹن ایچ کے درمیان نوک جھونک کا معاملہ چلتا رہا ہوگا۔ اور اس میں نرمی اور شدت کے ساتھ ہی مسز ہاروے کا طرز عمل بھی بدلتا رہا ہوگا۔ بالاخر اس نے کشمیر سے کوچ کر جانے میں ہی عافیت سمجھی ہوگی۔ اس کے بعد ایسا لگتا ہے کہ کیپٹن ایچ اس کی زندگی سے نکل گیا اس نے کسی اور سمت قسمت آزمائی شروع کر دی ہوگی کیونکہ بقول اس کے وہ سری نگر سے اسی دن کانگڑا کی طرف نکل گیا تھا۔ اور پھر اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ مسز ہاروے کی کہانی میں اب (We) کی جگہ (I) نے لے لی ہے۔ اور اس کے بعد کا سارا بیان صیغہ واحد متکلم ہی میں ہے۔

دوبارہ آمد

کوئی نو ماہ بعد اگلے سال جون میں وہ پنجاب بھر کی سیر و سیاحت کے بعد دوبارہ کشمیر آئی۔ پہلی مرتبہ وہ سری نگر سے براستہ اسلام آباد ائنت ناگ جموں سے ہوتی ہوئی کشمیر سے پنجاب میں داخل ہوئی تھی۔ اس مرتبہ وہ بالکل متضاد سمت سے یعنی دریائے جہلم کے ساتھ چلتے ہوئے بارہ مولہ سے وادی میں داخل ہوئی اور بذریعہ کشتی جھیل وولر کی سیر کو نکل گئی۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ کوئی کیپٹن ایچ نہ تھا۔ البتہ تلخ و شیریں یادیں بھی اس کے ساتھ

تھیں۔ سوپور کے قریب ایک گھنے سایہ دار درخت کی خنک چھاؤں میں اس نے دن کا کھانا
کھایا اور پھر جھیل ولر کی سطح آب پر تتلی کی طرح تیرتی پھری۔ جھیل مانسبل نے بھی اس کے
قلب ونظر کو تازگی بخشی۔ اب کی بار نہ کوئی کیپٹن ایچ اس کے لیے بلائے بے درماں بنا تھا اور
نہ مچھروں کی یورش نے اس کا ناک میں دم کیا تھا۔ کیونکہ یہ جون کا مہینہ تھا۔ کشمیر میں
سیاحت کے لیے خوشگوار ترین موسم۔ پھر وہاں تمام مقامات پر گئی جہاں نو ماہ قبل کیپٹن ایچ
کے ساتھ وہ جا چکی تھی۔ نشاط باغ کا وہ گوشہ بھی دیکھا جہاں وہ قیام پذیر رہی اور منشی باغ
بھی جہاں وہ اور اس کا ہمسفر مقیم تھے۔ کیپٹن ایچ سے اس کا محبت اور نفرت (Love
hate) کا کھیل ہمیں اس کے دوسرے سفر کشمیر میں بھی جابجا جلوہ گر نظر آتا ہے۔ کبھی وہ
نشاط باغ کے اس چنار کے درخت کے پتے بطور یادگار اپنے پاس محفوظ کرتی نظر آرہی ہے
جس کے نیچے وہ اور کیپٹن ایچ گھنٹوں بیٹھے راز و نیاز کی باتیں کیا کرتے تھے۔

سمر ہاؤس میں قیام

اس مرتبہ اس نے نشاط باغ میں خواتین کے لیے مختص حصے میں قیام کرنے کے
بجائے سمر ہاؤس میں قیام کیا۔ باغ نشاط کا یہ حصہ اسے بہت پسند آیا۔ سنگ مرمر کی بنی ہوئی
محرابیں، شور مچاتے پانی کے جھرنے، رنگ و نور میں بسے ہوئے فوارے، اور پس منظر میں
جھیل ڈل کا خوبصورت نظارہ......... یہ سب کچھ اسے بہت بھلا لگ رہا تھا۔ اس مرتبہ وہ
جھیل ڈل میں بنے ہوئے جزیرے چار چنار بھی گئی۔ جہاں قبل ازیں وکٹر ژاک مونٹ
قیام کر چکا تھا اور جہاں چارلس ہیوگل ہنڈسن اور وائینے نے اپنی یادگار لوح نصب کی تھی۔
چند ٹوٹے پھوٹے ستونوں ایک عمارت کے کھنڈرات اور چند درختوں کے سوا یہاں اور کچھ
نہ تھا۔ اس جزیرے کی ویرانی سے وہ بہت پریشان ہوئی واپسی پر دلاور خان کے باغ بھی گئی
جہاں قبل ازیں یورپی سیاح قیام کرتے تھے۔ ژاک مونٹ، مور کرافٹ، فاسٹر، ہیوگل،

ہنڈرسن، وائینے ،ڈی سدری اور جوزف ولف سب نے یہاں ہی قیام کیا تھا۔ دلاور خان کا باغ اسے ایک آنکھ نہیں بھایا۔ اس کی سیر سے وہ حد درجہ مایوس ہوئی۔

انسانی ڈھانچے

چار چنار اور دلاور خان کے باغ کی خستہ حالی اور ویرانی پر آنسو بہانے کے بعد مسز ہاروے آبی گزرگاہ کے راستے واپس اپنے ٹھکانے پر آ گئی۔ گزشتہ نو ماہ کے دوران کوئی بھی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوئی تھی۔ وہی ڈوگروں کا ظلم و ستم تھا اور وہی کشمیریوں کی تیرہ بختی تھی۔ گزشتہ مرتبہ جب وہ سری نگر میں اقامت گزین تھی تو ایک دن اس نے سری نگر شہر سے گزرتے ہوئے لکڑی کے دو بڑے پنجروں میں دو انسان نما ڈھانچے دیکھے تھے جن پر بمشکل ہی زندہ ہونے کا گمان کیا جاسکتا تھا۔ ان کے جسم چیتھڑوں میں لپیٹے ہوئے تھے اور وہ دونوں نیم مردہ انسانی ڈھانچے معلوم ہوتے تھے۔ مسز ہاروے کے استفار پر سرکاری اہلکاروں نے اسے بتایا تھا کہ وہ دونوں قتل کے مقدمے میں ماخوذ ملزم تھے۔ جنہیں آمادہ بغاوت کشمیریوں کے لیے نشان عبرت بنا دیا گیا تھا۔ اب جبکہ نو ماہ گزرنے کے بعد مسز ہاروے سری نگر آئی تو موت وحیات کی کش مکش میں گرفتار وہ دونوں ڈھانچے بھی اسی جگہ اسی حال میں موجود تھے۔

اسی شام جو سری نگر میں اس کی آخری شام تھی اس کے نوکر نے غلطی سے تھرمامیٹر توڑ دیا تھا۔ بس پھر کیا تھا؟ مسز ہاروے کا پارہ چڑھ گیا۔ پہلے تو اس نے ملازم کی خوب خبر لی۔ پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اتنی روئی جتنی گزشتہ سال اپنے محبوب کُتے کی موت پر بھی نہیں روئی تھی۔ روزانہ کا درجہ حرارت کا ریکارڈ کرنا اس کا معمول تھا اور اب وہ اس معمول کو جاری رکھنے کی پوزیشن میں نہ رہی تھی۔ اس نے تھرمامیٹر کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو بار بار جوڑ کر اسے کارآمد بنانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اسے کون بتاتا کہ

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا

واپسی

سری نگر میں کوئی ہفتہ بھر قیام کرنے کے بعد سیماب صفت، خطر پسند اور سفر نصیب مسز ہاروے اسلام آباد کی طرف روانہ ہوئی۔ وہاں سے وہ چشمہ ویری ناگ اور جہانگیر کا باغ دیکھنے کے بعد براستہ بانہال جموں جانا چاہتی تھی۔ راستے میں اس قدر بارش ہوئی کہ اس کا سارا راستہ جل تھل ہو گیا۔ وہ گدھا جس پر مسز ہاروے سوار تھی دھان کے کھیت میں گر گیا اور مسز ہاروے کیچڑ سے لت پت ہو گئی۔ رات کا وقت تھا۔ موسلا دھار بارش جاری تھی اور دلوں کو دہلا دینے والی بادلوں کی گرج اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی بجلی کی چمک نے ماحول کو اور بھی ہیبت ناک بنا دیا تھا۔ مسز ہاروے، اس کا گدھا اور ملازم تینوں بارش میں بھیگے، گرج چمک میں سہمے اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے اپنی منزل ویری ناگ کی جانب رواں دواں تھے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بجلی لمحہ بھر کے لیے چمکتی تو ساری وادی روشنی میں نہا جاتی لیکن اگلے ہی لمحے تاریکی کی مہیب چادر ساری وادی کو دوبارہ اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ بادل کی خوفناک گرج سے دل دہل جاتے ایسے میں ڈری سہمی اور تھکی ماندی مسز ہاروے کی حالت زار ناگفتنی تھی۔ وہ لکھتی ہے کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے تاہم اسے حوصلے سے کام لینا تھا کیوں کہ غریب الوطنی میں ایک صنف نازک کے لیے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے حوصلہ ہی واحد ہتھیار تھا۔ گرتے پڑتے، روتے دھوتے وہ رات کے پچھلے پہر ویری ناگ پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ جہاں اس نے بقیہ رات اور اگلے دن کا کچھ حصہ آرام کیا۔

اگلے دن جب وہ جاگی تو گزشتہ رات کی تلخیاں کافی حد تک اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھیں۔ تھکاوٹ کسی حد تک اتر چکی تھی۔ وہ تازہ دم ہو کر ایک نئی مہم سر کرنے کے لیے

تیار تھی۔ وہ تو خیر گزری کہ اس قدر تیز بارش میں بھیگ کر بھی وہ نمونیئے سے بچ گئی تھی۔ اب وہ مکمل طور پر خوش وخرم اور تروتازہ تھی۔ آج اسے ویری ناگ سے بانہال کی چوٹی تک کا سفر کرنا تھا وہ دن بھر کے سفر کے بعد جب وہ بانہال کی چوٹی پر پہنچی تو اس نے مڑ کر وادی کشمیر کا آخری نظارہ کیا۔ اس چوٹی سے وسیع وعریض وادی کشمیر ہتھیلی کی طرح اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلی نظر آتی ہے اور دریائے جہلم قسمت کی لکیر کی طرح اسے بیچوں بیچ سے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے دوسرے سرے تک چلا یا جاتا ہے۔ یہاں سے وادی کے تمام نشیب وفراز، وادیاں اور مرغزار، سرو اور چنار واضح نظر آتے ہیں۔

۱۷

کھیل تماشے

برطانوی اور یورپی باشندے گرمی کی شدت کے عادی نہ تھے جو برصغیر کے میدانی علاقوں کے باشندوں کا خاصہ ہے۔ موسم گرما کی جھلسا دینے والی دھوپ میں ہندوستان کے میدانی علاقوں میں برطانوی باشندوں کی زندگی اجیرن ہو کر رہ جاتی تھی۔ مزید برآں میدانی علاقوں میں موسم گرما میں مختلف وبائیں پھوٹ پڑتیں۔ مقامی باشندے تو ان مصائب و آلام کے عادی تھے اور یہ سب کچھ جھیلنے پر مجبور بھی، لیکن گورے آقاؤں کے لیے تو ایسی کوئی مجبوری نہ تھی کہ وہ ہندوستان کے تپتے میدان میں کباب بنتے رہیں۔ لہٰذا انھوں نے کشمیر کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ انیسوی صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے کشمیر برطانوی باشندوں کا دوسرا وطن بن چکا تھا۔ ہندوستان میں تعینات برطانوی افسروں کے

خاندان بڑی تعداد میں گرمیوں کی شدت سے نجات پانے اور کشمیر کے خنک موسموں اور خوبصورت نظاروں سے لطف اندوز ہونے کشمیر پہنچ جاتے۔

کھیل تماشے انسان کی فطرت میں شامل ہیں اور جیسا کہ سر فرانسیس نے کہا ہے:۔

''انسان ساری زندگی چل پھر کر نہیں گزار سکتا۔ اس کی فطرت ایک گیند کی متلاشی ہے چاہے وہ پولو کی گیند ہو، ٹینس کی، گاف کی یا محض لکڑی کی بنی ہوئی کھردری سی گیند....... جب تک اس کے پاس کھیلنے کے لیے کسی قسم کی گیند نہ ہو وہ درحقیقت خوش نہیں رہ سکتا''

قیام کشمیر کے دوران میں یورپی باشندے زیادہ تر وقت سیر و سیاحت ہی پر صرف کرتے تھے اور اس وادی کے خوبصورت مقامات سے جی بھر کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ تاہم کچھ وقت کھیل کود میں بھی صرف کرتے تھے۔ یورپی باشندوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے ساتھ ہی سری نگر بالخصوص اور دوسرے شہروں میں بالعموم کرکٹ گراؤنڈ بننے لگے، کورٹ وجود میں آنے لگے، ہاکی اور فٹ بال کے میچ کھیلے جانے لگے۔۔۔ پولو اور گاف کے مقابلے منعقد ہونے لگے اور موسم گرما میں کشمیر کی خنک فضاؤں میں کھیل تماشے کی سرگرمیوں سے ماحول میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہونے لگا۔

افراد واقوام کے شکاری

شکار زمانہ قدیم سے ہی بادشاہوں اور رؤسا کا مشغلہ رہا ہے۔ اگر چہ تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانوں اور قوموں کا شکار بھی مروج ومتداول رہا ہے۔ طاقتور انسان کمزور انسانوں کا اور طاقتور قومیں کمزور قوموں کا شکار کر کے اپنے ذوق کی تسکین کا سامان کرتی رہی ہیں۔ کبھی سات سمندر پار سے آ کر اور کبھی پڑوس سے اٹھ کر بے کس اور مجبور انسانوں کو غلام بنا کر لوگ بادشاہ یا رئیس کہلاتے تھے اور شکار ہونے والوں سے اپنی شکاری طبیعت اور مہارت کی داد بھی جبراً وصول کرتے تھے۔ افراد واقوام کے یہ شکاری بھی جب انسانی شکار سے اکتا جاتے تو کچھ وقت کے لیے شہروں کو چھوڑ کر جنگل میں نکل جاتے اور جانوروں اور پرندوں کا شکار کر کے اپنے اسی ذوق کی تسکین کا سامان بہ انداز دگر کرتے تھے۔ انگریز جو تجارت اور شکار میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ تجارت میں وہ کشمیر تک کو لگے بھاؤ فروخت کر چکے تھے اور شکار کے معاملے میں تو دنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ کرنے کا سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ قوموں کا شکار وہ اس مہارت سے کرتے تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی آزاد قوموں کو انہوں نے زندہ شکار کر کے اپنے سامراجی پنجرے میں بند کر لیا تھا۔

ایسے ماہر شکاریوں کے لیے کشمیر حقیقی معنوں میں ایک بہترین شکارگاہ تھی۔ کشمیر میں بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی شکاریات کے میدان میں بھی بڑی ترقی ہوئی۔ ڈوگرہ دور کے آغاز کے ساتھ ہی اگر چہ شکار کے لیے لائسنس کا حصول ضروری قرار پایا تھا لیکن عملاً یہ پابندی صرف مقامی باشندوں کے لیے تھی۔ سیر وسیاحت پر آنے والے برطانوی باشندوں کو شکار کے لائسنس بہ اصرار دیئے جاتے تھے اور وہ جی بھر کر ہر قسم کے نادر ونایاب جانوروں اور پرندوں کا شکار کرنے میں آزاد تھے۔ کوئی باز پرس کرنے والا نہ تھا۔

1900ء میں شالیمار باغ کے عقب میں ہروان کے مقام پر ٹراؤٹ مچھلیوں کی

افزائش کے لیے ہیچری قائم کی گئی۔ ڈیوک آف بریڈ فورڈ نے برطانیہ سے اعلیٰ نسل کی ٹراوٹ مچھلیاں افزائش نسل کی غرض سے دریاؤں اور ندی نالوں میں چھوڑیں تا کہ یہاں کے ٹھنڈے میٹھے اور تازہ پانیوں میں ٹراوٹ کی خوب پرورش ہو اور صاحب لوگ جب چاہیں اور جہاں سے چاہیں ان کا شکار کر سکیں۔

مرغابیوں کا شکار

فرانسس ینگ ہسبنڈ نے مرغابی کے شکار کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''ایک دن میں اپنے دوستوں کے ہمراہ جھیل میں مرغابی کے شکار پر نکلا تھا۔ دور کہیں سے گولی چلنے کی آوار آئی دفعتاً ہم نے دیکھا کہ جھیل کے دوسرے کنارے سے کالی گھٹائیں امڈ آئیں اور سائیں سائیں کی آواز کے ساتھ ہی ہماری جانب بڑھنے لگیں۔ سائیں سائیں کی آواز گڑگڑاہٹ میں تبدیل ہوگئی اور لمحہ بہ لمحہ آواز کا شور بڑھنے لگا۔ یہ دراصل کالی گھٹائیں نہ تھیں بلکہ مرغابیوں کا غول تھا جس نے چند ہی لمحوں میں سارے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ مرغابیاں شور مچاتی، قلابازیاں کھاتی، غوطے لگاتی محو پرواز تھیں۔ دائیں سے بائیں بائیں سے دائیں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر اڑتی، ایک دوسری سے ٹکراتی، لڑکھڑاتی، سنبھلتی مسلسل محو پرواز تھیں۔ ان کی تعداد لاکھوں میں تھی اور ان میں سے کسی ایک کا نشانہ لینا ممکن نہ تھا۔ میرے ساتھیوں نے بغیر نشانہ لیے فائر کرنے شروع کیے اور یکے بعد دیگرے بے شمار مرغابیاں ان کی بندوق کا نشانہ بنیں۔''

فرانسس ینگ ہسبنڈ کے بیان کے مطابق اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اس

دن پندرہ سومرغابیوں کا شکار کیا اور بمشکل انہیں اٹھا کر اپنی رہائش گاہ تک لا سکے۔

کیپٹن نائیٹ نے اپنی چھٹیوں کی یادداشت میں جو 1883ء میں شائع ہوئی، بیان کیا ہے کہ اس نے ایک دیوہیکل بھورے ریچھ کا نشانہ لے کر گولی داغ دی۔ ریچھ گولی کھا کر پہاڑی کی عمودی کھائی سے نیچے گر گیا۔ لیکن ''میں اتنا تھک چکا تھا کہ کھائی سے اتر کر ریچھ کا معائنہ نہ کر سکا کہ اسے کس جگہ گولی لگی تھی۔'' ملاحظہ فرمائیے کہ کیپٹن بہادر نے اس لاپرواہی سے محض نشانہ بازی کے ذوق کی تسکین کے لیے اس نادر و نایاب جانور کی زندگی چھین لی اور پھر اس کی موت کا تماشا دیکھنے یا اس کی لاش کا معائنہ کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ فرمائی۔ وہ ایک آقا تھا اور اس سے کون پوچھ سکتا تھا! یہی جرم اگر کسی غریب کشمیری سے سرزد ہوتا تو ریچھ کے مرنے سے پہلے ہی وہ خود بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو چکا ہوتا ......!

ہاؤس بوٹ

کشمیر میں شکار کی یہ سرگرمیاں موسم گرما تک ہی محدود نہ تھیں۔ موسم سرما میں تو شکار کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس دور میں کشمیر میں سردیوں کے یخ بستہ موسم میں قیام کی خاطر خواہ سہولتیں نہ تھیں۔ بڑی تعداد میں ریسٹ ہاؤس اور ٹورسٹ ریزارٹ ابھی تک نہ بنے تھے۔ موسم سرما میں زندگی ہی منجمد ہو کر رہ جاتی تھی۔ لیکن ایسے میں بھی شکار سے دلچسپی رکھنے والے من چلے ادھر کا رخ کرتے تھے اور برف کی سفید چادر سے ڈھکی اس وادی میں گھوم پھر کر شکار سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

ٹی ایم کنیرڈ بھی ایسا ہی ایک ماہر شکاریات تھا جس نے 1880ء کا موسم سرما کشمیر میں گزارا اور مرغابی سے لے کر ہرن تک ہر قسم کے جانوروں اور پرندوں کا جی بھر کر شکار کیا۔ مہاراجہ نے فرمان جاری کر رکھا تھا کہ کوئی غیر ملکی باشندہ (Non state subject) ریاست میں

زمین نہیں خرید سکتا (یہ قانون اب بھی آزاد اور مقبوضہ کشمیر میں نافذ العمل ہے) سیاحوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے وادی میں کرائے کے مکانات تھے ہی کم اور جو تھے وہ بھی روزمرہ کی سہولتوں سے محروم تھے۔ اس یخ بستہ موسم میں کھلے آسمان تلے خیمہ نصب کر کے شب بسری کرنا برف کی منجمد سیل میں تبدیل ہونے کے مترادف تھا۔ ایسے میں مسٹر کینیرڈ کے سائنسی ذہن نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا کہ اس نے خود ایک ہاؤس بوٹ ڈیزائن کی اور اسے اپنی نگرانی میں تیار کروایا۔ تاکہ وہ ہر سال جس موسم میں بھی کشمیر آنا چاہے اور ویری ناگ سے بارہ مولا تک وادی میں جہاں کہیں بھی قیام کرنا چاہے، اس کا کشتی مکان ہر جگہ اس کی خدمت کے لیے آموجود ہو اور مہاراجہ کے قانون کی خلاف ورزی بھی نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں ہاؤس بوٹ کی آئیڈیئے کا خالق یہی مسٹر ٹی ایم کنیرڈ ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں۔ کشمیر میں ہاؤس بوٹ زمانہ قدیم سے مستعمل ہے۔ یہ ایک روایتی کشمیری کشتی ہوتی جس میں رہائش کی سہولت بھی موجود تھی۔ اسے کشمیری ڈونگا کہتے تھے۔ مسٹر کنیرڈ کی تیار کردہ ہاؤس بوٹ دراصل اسی ڈونگے کی ترقی یافتہ شکل تھی۔ اس ہاؤس بوٹ کی تیاری کے ساتھ ہی اختراع پسند کشمیریوں کو اپنی فنی مہارت اور جدت پسند فطرت کے اظہار کے لیے گویا ایک اور راستہ مل گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے جدید سے جدید تر ہاؤس بوٹ تیار ہونے لگیں۔ کینرڈ کے بیس سال کے بعد فرانس ینگ ہسبنڈ (Fransis young Husband) کشمیر آیا تو اس نے دیکھا کہ ہاؤس بوٹ کی تعداد سو تک پہنچ چکی تھی۔

ہاؤس بوٹ کشمیر کی سیاحتی زندگی کے لوازمات میں شامل ہے۔ اس کی تیاری، ترتیب، تزئین، آرائش، افراد کی مالی حیثیت، ذوق اور طبیعت کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک کشتی ہے جس پر چھت ڈال کر اور اندر سے Partition کر کے اسے مکان کی شکل دی گئی ہے۔ سطح آب پر تیرتا ہوا ایک مکان.......... لیکن حقیقت صرف اتنی

سی نہیں۔ انسان ازل سے خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ جیسے آج سڑکوں پر فراٹے بھرتی مختلف انواع واقسام کی گاڑیاں اس ابتدائی گاڑی سے کوئی مماثلت یا مشابہت نہیں رکھتیں جو پہیوں والی گاڑی کے موجد نے سب سے پہلے تیار کی ہوگی۔ وہ تو بیچاری ایک سادہ چار پہیوں والا ایک ڈھانچہ ہوئی ہوگی۔ جسے صدیوں کی محنت، مہارت، ذہانت اور ہنر مندی نے خوبصورتی برق رفتاری اور آرام وسہولت کی معراج تک پہنچا دیا۔ یا ہوائی جہاز کے موجد رائٹ برادران نے جو ہوائی جہاز ایجاد کیا تھا، آج کا ہوائی جہاز ماسوائے اس کہ اسی اصول پر کام کرتا ہے جس اصول پر رائٹ برادران کا تیار کردہ جہاز کام کرتا ہوگا، اس اولین جہاز سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ وہ سادہ سا اڑن کھٹولا جو رائٹ برادران نے تیار کیا تھا، کہنے کو وہ بھی ایک ہوائی جہاز ہی تھا اور آج کے سپر سانک (Super sonic) طیارے بھی ہوائی جہاز ہی ہیں لیکن فرق ان دونوں میں زمین آسمان کا ہے۔

یہی کچھ مسٹر کنیرڈ کی تیار کردہ ہاؤس بوٹ اور آج کی جدید ترین ہاؤس بوٹ کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ مسٹر کنیرڈ سے پہلے بھی ہاؤس بوٹ کی کوئی ابتدائی یا خام شکل کشمیر کے دریاؤں اور جھیلوں کی سطح آب پر موجود تھی جسے کشمیری ڈونگا کہا جاتا تھا۔ کنیرڈ نے اسے محض Modify کیا تھا تاہم اب جو ہاؤس بوٹ کشمیر میں پائے جاتے ہیں ان پر جدید ترین لگژری اپارٹمنٹس کا گمان ہوتا ہے۔ یہ ایک مکمل اور تمام سہولتوں سے آراستہ گھر ہوتا ہے جو کم از کم تین اٹیچڈ باتھ، ڈبل بیڈ رومز، ڈائننگ روم، ڈرائنگ روم اور برآمدہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک خاص سلیقے اور ترتیب کے ساتھ اعلیٰ قسم کی عمارتی لکڑی سے تعمیر کیا جاتا ہے۔ لکڑی کی دیواروں پر کندہ کاری اور پیپر ماشی کا اعلیٰ معیار کا کام کیا جاتا ہے۔ ساری ہاؤس بوٹ کو عمدہ قالینوں اور مقامی کاریگروں کے بنائے ہوئے مختلف ڈیزائنوں کے اعلیٰ پیمانے کے فرنیچر سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ الغرض اپنے وطن سے

سینکڑوں ہزاروں کلومیٹر دور اس دورافتادہ وادی کشمیر میں ایک سیاح کو اپنے آرام اور آرائش کے لیے وہ سب کچھ مل جاتا ہے جس کا وہ متمنی ہوتا ہے۔ ڈونگے سے کنیئرڈ کی ہاؤس بوٹ اور کنیئرڈ کی ہاؤس بوٹ سے آج کی آراستہ وپیراستہ خوبصورت وخوشنما اور جدید ترین ہاؤس بوٹ تک اس فن میں پیش رفت کی یہ ایک اجمالی سی داستان تھی۔ اگر یہ بدقسمت ریاست 1947ء کے بعد بھارتی استعمار کے شکنجے میں جا کر آزاد دنیا سے یوں کٹ نہ جاتی اور دنیا بھر کے سیاحوں کو آزادی کے ساتھ اس وادی لالہ و گُل کی سیاحت کے مواقع میسر ہوتے تو جدت واختراع کے میدان میں کشمیریوں کی پیش رفت کا عالم کیا ہوتا.........!

کنیئرڈ کے بعد ایک اور برطانوی مسٹر اے پیٹروکوکینو نے اپنی کتاب (A-Petrocokino) کشمیر میں وارد ہوا۔ اس نے مسٹر کنیئرڈ کی اختراع میں یہ اضافہ کیا کہ ایک اور ڈونگا خرید کر اسے بھی ہاؤس بوٹ کی شکل دی اور اسے ملاحوں، خانساموں اور اپنے ذاتی ملازموں کی رہائش اور خوراک کو ذخیرہ کرنے کے لیے استعمال کیا۔ وہ اپنی ہاؤس بوٹ کے ساتھ ایک اور ہاؤس بوٹ بھی ملازموں اور اشیائے ضرورت سے لبریز وادی کے طول وعرض میں لیے گھومتا پھرتا اور سیر وسیاحت کے مزے لیتا رہا ۔ یہ انداز بڑا پرتعیش تھا۔ پھر اس کی دیکھا دیکھی دوسرے سیاح بھی اسی طرح اپنے قیام کشمیر کو یادگار بنانے کے لیے مختلف اختراعات سے کام لینے لگے۔ یہ اور اس کی دوسری تفصیلات مسٹر پیٹروکینو نے اپنی کتاب Three weeks in a Houseboat میں بیان کی ہیں۔ یہ سیاح 1920ء میں کشمیر کی سیاحت پر آیا تھا اور اپنے پیشرو دوسرے سیاحوں کی طرح اس نے بھی اپنے سفر کشمیر کے خوبصورت اور دلچسپ واقعات سے اپنے برطانوی ہم وطنوں کو آگاہ کرنے کے لیے اس کتاب کا سہارا لیا۔

ایک برطانوی گھریلو خاتون مسز بروز (Mrs.Burrows) جس نے 1894ء اپنے شوہر مسٹر بروز اور اپنے بچے کے ہمراہ چار ماہ تک وادی میں قیام کیا، اپنے قیام کشمیر کے تاثرات اپنی کتاب Cashmir en Fammile میں بیان کیے ہیں۔ مسز بروز چونکہ ایک عملی قسم کی گھریلو خاتون تھی اس لیے اسکے تمام تر تجربات گھریلو زندگی، کھانے پینے، کپڑے دھونے، روزمرہ اشیائے صرف کی خریداری اور اس قسم کے دوسرے گھریلو کام کاج کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ سیاحوں کو بھی انہی معاملات میں مشورے دیتی ہے کہ کشمیر آنے کے لیے کن کن امور کو پیش نظر رکھیں، کون کون سی چیزیں ہمراہ لائیں اور کھانے پینے کی چیزیں کس طرح تیار کریں وغیرہ وغیرہ۔

مسٹر اور مسز بروز اپریل کے مہینے میں کشمیر میں وارد ہوئے۔ ہندوستان میں اپریل کا مہنیہ گرمیوں کا مہینہ تصور ہوتا ہے۔ جبکہ کشمیر میں ابھی تک سردی زوروں پر ہوتی ہے، پہاڑوں پر ابھی تک برف کی تہیں جمی ہوتی ہیں اور یخ بستہ برفانی ہوائیں وادی کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسز بروز کے سفرنامے میں اس کیفیت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ جس سے وہ اپنے قیام کشمیر کے ابتدائی دنوں میں گزرے۔ سردی کی شکایت، مناسب رہائش گاہ کی عدم فراہمی کا رونا، سائیں سائیں کرتی سرد ہواؤں کے خلاف احتجاج، کھانے پکانے میں مشکلات کا تذکرہ......... غرض جوں جوں موسم میں حدت پیدا ہوتی جاتی ہے، مسز بروز کی طبیعت میں شگفتگی آتی جاتی ہے اور جھنجھلاہٹ کی جگہ خوش دلی لے لیتی ہے۔

مسٹر اور مسز بروز نے وادی کی سیاحت کا آغاز مانسبل سے کیا۔ یہاں انہوں نے جھیل مانسبل کے کنارے تعمیر شدہ نور جہاں کے باغ میں قیام کیا۔ دو ہفتے کے بعد وہ براستہ پامپور پہلگام کی جانب روانہ ہوگئے۔ پامپور سے انہوں نے بھاری مقدار میں بسکٹ

خریدے۔شاید پامپور اس زمانے میں ایک خاص قسم کے بسکٹوں کی وجہ سے مشہور تھا یا انھوں نے روائتی کشمیری کلچے کو بسکٹ سمجھ لیا۔ بہرحال یہ بسکٹ انہیں بہت اچھے لگے، جن کا ذائقہ، خوشبو اور تازگی تادیر برقرار رہتی تھی۔

گلمرگ میں انھوں نے لکڑی کے ایک چھوٹے سے نوتعمیر شدہ جھونپڑے میں قیام کیا جو سیاحوں کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ مسٹر اور مسز بروز نے اس کے صحن میں ایک خیمہ بھی نصب کر رکھا تھا۔ اس لیے انہیں جگہ کی کمی کی شکایت نہیں ہوئی۔ گلمرگ جیسے خوبصورت اور صحت افزاء ہل سٹیشن پر ان کا قیام بڑا خوشگوار گزرا۔ یہ جون کا مہینہ تھا۔ حد نظر تک پھیلے ہوئے سرسبز میدان تھے۔ ان کے پس منظر میں دیودار کے دیوہیکل درخت۔ اس کے بعد کے جنگل کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ جنگل کے عقب میں پیر پنجال کے پہاڑی سلسلے اور دور برف سے ڈھکے بلند ہمالیائی سلسلے تھے۔ رنگ برنگے پھول اور مشام جان کو معطر کرتی خوشبوئیں کسی اور ہی جہاں کا پتہ دے رہی تھیں۔ فطرت کے پرستار سیاح کو اور کیا چاہیے۔

حسنِ بے پرواہ کو اپنی بے حجابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن!

گرمیوں کا عرصہ گلمرگ کی رومان پرور اور وجد آفریں فضاؤں میں گزارنے کے بعد بروز (Burrows) ستمبر کے مہینہ میں واپس بمبئ چلے گئے۔ جہاں مسٹر بروز اپنی ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ وہیں بیٹھ کر مسز بروز نے اپنی سفر کشمیر کی یادداشتوں کو قلم بند کیا اور ہندوستان سے باہر کی دنیا کو کشمیر کے رومان پرور حسن کی ایک اور تصویر دیکھنے کو ملی۔ گھریلو زندگی کا رنگ لیے ایک تازہ تصویر.........!

۱۸

موتیوں کی مالا

1902ء میں ایک اور برطانوی خاتون مس فلورنس پاربری نے اپنی والدہ کے ہمراہ کشمیر کی سیاحت کی۔ اس کا سفرنامہ Emerald set with pearls کے نام سے 1909ء میں شائع ہوا۔ اپنے سفرنامے میں پاربری نے دل کھول کر کشمیر کے حسن ودلکشی کی تعریف کی ہے۔ اس سفرنامے میں متعدد تصاویر بھی شامل ہیں جن میں سے ایک تصویر اس منظر کی ہے جب 1822ء میں برلن میں جرمن اور روسی شاہی خاندانوں کی ایک مشترکہ ضیافت میں تھامس مور کی نظم ''لالہ رخ'' کو سٹیج ڈرامے کے طور پر پیش کیا گیا تھا اور اس موقع پر شاہی خاندان کے افراد نے خود اداکاری کی تھی۔

اپنی والدہ کے ساتھ جب مس پاربری نے اس وادی جنت نظیر میں قدم رکھا تو وادی کے حسن خوابیدہ کی جھلک دیکھتے ہی ماں بیٹی دونوں مبہوت ہوگئیں۔

''میں اکثر اپنی والدہ کو زیر لب بڑبڑاتے پاتی۔ کان لگا کر غور سے سننے کی کوشش کرتی تو۔ یہی سرگوشی سماعت سے ٹکراتی .... ''خوبصورت'' .... ''خوبصورت'' اور میں بھی بے اختیار پکار اٹھتی ,,خوبصورت،،.........,,خوبصورت،،

ایک مرتبہ وادی لدر میں ایک خوبصورت مرغزار میں.........ایک پہاڑی کے دامن میں ایسے ہی ایک منظر سے وہ دونوں اتنی متاثر ہوئیں کہ دونوں نے اپنے اپنے گیٹار سنبھالے اور خوبصورت دھنیں چھیڑ دیں۔ موسیقی کی خوبصورت دھنیں جب اردگرد پھیلے

ہوئے چرواہوں اور مقامی باشندوں کے کانوں میں رس گھولنے لگیں تو ان سے رہا نہ گیا اور وہ بھی بے اختیار آواز کی سمت چل پڑے۔ قریب پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ دو انگریز خواتین دنیا مافیہا سے بے نیاز موسیقی کی خوبصورت دھنیں اس خوبصورت ماحول میں بکھیرنے میں مصروف ہیں اور ان کی انگلیاں آلہ موسیقی پر تھرک تھرک کر صوت کا جادو جگا رہی ہیں۔ اپنے گرد جمع ہونے والے ہجوم سے بے نیاز وہ دونوں اپنی دنیا میں مست تھیں۔ وہ تو خیر گزری کہ تماشائیوں کے اس ہجوم میں سے کسی نے ان سے کوئی بدتمیزی نہیں کی اور جب موسیقی سے ان کا جی بھر گیا تو وہ اٹھ کر چلتی بنیں۔

مس پاربری کو بھی اپنے پیشرو سیاحوں چارلس ہیوگل وغیرہ کی طرح قلیوں کی لڑائی، خانساموں کے عدم تعاون، ملازمین کے دنگا فساد اور زیورات اور نوادرات کے اپنے ہی ملازموں کے ہاتھوں چوری ہو جانے جیسے مسائل کا بار بار سامنا کرنا پڑا۔ اسے یہ بھی شکایت ہے کہ ''میرا خانساماں میرے لیے ترجیحاً دریا کے گدلے مٹیالے پانی میں کھانا تیار کرتا ہے۔''

کشمیر میں گائے ذبح کرنے پر پابندی تھی کیونکہ ہندو اسے ماں کا درجہ دیتے ہیں اور پسند نہیں کرتے کہ کوئی ان کی مقدس ماں کو ذبح کر کے تکے، کباب، قورمہ اور قیمہ بنا کر کھا جائے۔ یہ صورت حال مس پاربری کے لیے بڑی تکلیف دہ ہے کہ اسے اپنے قیام کشمیر کے دوران گائے کا گوشت کھانے کو نہ مل سکا۔ وہ لکھتی ہے؛

> ''ایک برطانوی کے نقطہ نظر سے اس ملک (کشمیر) کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ یہاں گائے کو ایک مقدس ہستی کا درجہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ذبح کر کے بھوک کے مارے برطانوی سیاحوں کے لیے برطانیہ کا روایتی، روسٹ بیف، تیار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسا ظلم ہے جسے کوئی

برطانوی ہی محسوس کر سکتا ہے.......... ہم مٹن اور چکن کھا کھا کر اکتا گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ واپسی پر مری پہنچتے ہی "روسٹ بیف" تیار کرایا اور جی بھر کر کھایا۔"

کشمیری دکانداروں سے بھی اسے گلہ ہے کہ وہ نہایت بے ایمان اور بے اصول ہیں۔ سیاحوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے منہ مانگے دام وصول کرتے ہیں اور گھٹیا مال فروخت کرتے ہیں۔

مس پاربری نے نوادرات ایک ایک سوداگر سے جسے اس نے Suffering Moses کا نام دیا ہے، کچھ نوادرات بھی خریدے۔ اس کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص برطانوی سیاحوں میں بڑا مقبول تھا وہ اپنے وطن واپس جانے سے پہلے اسی سے نوادرات اور اپنے عزیزوں کے لیے تحفے تحائف خرید کر لے جاتے تھے۔ مس پاربری کے بیان کے مطابق وہ ایک دن اپنے ہاؤس بوٹ میں بیٹھی تھی کہ ایک اجنبی شخص اس کی ہاؤس بوٹ میں داخل ہوا اور آتے ہی اعلان کرنے کے انداز میں کہنے لگا "میں Suffering Moses ہوں۔ تمام صاحب لوگ اور میم صاحب مجھ ہی سے چیزیں خریدتے ہیں۔" اس نے اپنی سحر انگیز شخصیت اور لچھے دار باتوں سے مس پاربری کو اتنا متاثر کیا کہ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی ڈھیر سارے تحائف اس سے خرید لیے۔

اس طرح ایک دن شکارے میں مس پاربری جھیل ڈل کی سیر کو نکلی ہوئی تھی۔ ایک کشمیری دکاندار ایک دوسرے شکارے میں اپنی دکان سجائے تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ میم صاحب! مجھ سے سامان خریدیئے! میں بہت سستا بیچنے والا دکاندار ہوں۔"، اتنے میں ایک اور گشتی دکاندار اپنا شکارا لیے آگے بڑھا۔ "نہیں میم صاحب! یہ دھوکے باز شخص ہے.......... دراصل میں سستا سودا بیچتا ہوں.......... مجھ سے خریدیئے.........." پھر

دونوں میں تکرار شروع ہوگئی۔ دونوں خود کو معصوم اور پاک صاف اور ایک دوسرے کو دھوکہ باز ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ایک اور دوکاندار اپنی کشتی چلاتا ہوا قریب آ گیا اور خود کو قابل اعتماد ثابت کرنے کے لیے اس نے ''میم صاحب'' کو ایک کاغذ تھمایا جو میم صاحب کے کسی پیشرو سیاح نے اسے دیا تھا اور وہ اسے ''پروانہ حسن کارکردگی'' یا ''پروانہ حسن کردار'' سمجھ رہا تھا۔ مس پار بری نے اس سے وہ تحریر لے کر پڑھی تو اس میں لکھا تھا:

This is the biggest thief and scoundrel that I have ever met.

اس طرح کے متعدد چھوٹے چھوٹے لیکن دلچسپ مشاہدات پار بری کی کتاب میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔

ماریون ڈوہٹی (Marion Doughty) ایک اور برطانوی سیاح ہے جس نے 1902ء میں براستہ جہلم ویلی تانگے پر کشمیر کا سفر کیا۔ اس نے اپنی سرگزشت A Road to The Kashmir Valley کے نام سے لکھی۔ جہلم ویلی کارٹ روڈ پر تانگے میں ایک طویل اور تکلیف دہ سفر نے مس پار بری کی طرح ماریون ڈوہٹی کا بھی براحال کیا۔ تنگ پہاڑوں اور عمودی کھائیوں سے گزرتی ہوئی، یہ تنگ اور ناہموار سڑک، جہاں ایک طرف سربکف پہاڑ سینہ تانے کھڑے ہوں اور دوسرے طرف محض چند فٹ نیچے تیز رفتار دریائے جہلم ٹھاٹھیں مارتا بہہ رہا ہو، ایک اناڑی شخص، مریل سے گدھے یا گھوڑے کو چابک مار مار کر بھگانے کی کوشش کررہا ہو، ایسے خوفناک راستے پر بے چاری ماریون ڈوہٹی یا مس پار بری تو کیا کوئی شیر دل پہلوان بھی ہوتا تو اس کا بھی پتا پانی ہو جاتا۔ لیکن اس سفر نصیب صنفِ نازک کو داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ اتنا تکلیف دہ اور جانکسل سفر اس نے پامردی سے کیا اور حرف شکایت زبان پہ نہ لائی، وہ لکھتی ہے:۔

''میں ایک مرتبہ آئرلینڈ میں ایک تیز رفتار چھکڑے سے گرگئی تھی اور اس کے پہیے میرے اوپر سے گزر گئے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ چھکڑوں کی دوڑ میں شرکت بھی کی تھی لیکن جتنا تلخ اور خوفناک تجربہ مجھے سری نگر کے سفر میں ہوا، اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا میں نے کبھی ایک پاگل بیل پر خلا کا سفر نہیں کیا ہے اور نہ کبھی چاند سے انگاروں سے دھکتی انگیٹھی میں گری ہوں لیکن ایسا اگر ہوتا بھی تو میں سمجھتی ہوں کہ چھکڑے کا یہ سفر اس سے کہیں زیادہ مشکل اور تکلیف دہ تھا۔''

یہی وجہ ہے کہ مسز پاربری اور ماریون ڈوہٹی نے 1902ء میں جب اپنے طور پر کشمیر سے واپسی کے لیے اس راستے کا انتخاب کیا تو یہ اس وقت محض ایک تانگہ روڈ تھی۔ اناڑی تانگہ بانوں نے ان غریب الوطن خواتین کو سوار کر کے جانے کس ترنگ میں تانگوں کو وہ سرپٹ دوڑایا کہ ان بے چاریوں کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ تو خیر گزری کہ دونوں ''میم صاحب'' یہ سب تشدد سہنے کے بعد اصل اور قابل شناخت حالت میں اپنے وطن واپس پہنچ گئیں۔ ورنہ آج ان کے اتنے خوبصورت سفرناموں سے انگریزی ادب محروم ہوتا۔ مسز ماریون ڈوہٹی بھی اپنے پیشرو سیاحوں کی طرح باذوق طرح دار اور اختراع پسند خاتون تھی۔ باٹنی اس کی پسند کا میدان تھا۔ اس نے جھیل ڈل میں ایک ہاؤس بوٹ کرائے پر لی تھی۔ وادی کشمیر سے سینکڑوں قسم کے نادر و نایاب پھولوں کو تلاش کر کے لانا اور مختلف ڈبوں، کانگڑیوں اور گملوں میں سجا کر ہاؤس بوٹ کی دیواروں اور چھت سے لٹکا دینا اس کا مشغلہ بن گیا تھا۔ اس کے ہاؤس بوٹ نے ایک چھوٹے سے باغ نباتات (Botanical garden) کی شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ بھنورے کی طرح دن بھر باغوں، کھیتوں، پہاڑوں اور مرغزاروں میں پھولوں کی تلاش میں ماری ماری پھرتی اور جو

بھی خوبصورت پھول اسے نظر آجاتا اسے لاکر اپنے ,,معلق باغ،، میں سجا لیتی.........اس گل پسندی، گل پروری اور گل نوازی نے اسے ایک عجیب مزاج اور ذوق سے آشنا کر دیا تھا۔ وہ وادی کشمیر میں فطرت کی بوقلمونیوں اور قدرت کی نیرنگیوں میں پوری طرح جذب ہو جاتی تھی ۔اسے بعض اوقات یوں لگتا کہ ساری وادی سفید اور نیلے رنگوں میں رنگی ہوئی ہے۔ سفید اور نیلے کا حسین امتزاج اس کا دامن دل موہ لیتا۔ نیلا آسمان اور سفید بادل نیلے سبزہ زار اور سفید پھول، نیلے پانی اور سفید پہاڑ . . . . . .یہ عجیب کنٹراسٹ (Contrast) اسے بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ اسے وادی کشمیر سبز و سفید لباس میں ملبوس ایک دلہن کی طرح حسین لگ رہی تھی۔ اس نے کشمیر سے پھولوں اور پودوں کے دو سو چھ نمونے جمع کیے اور اپنے ہمراہ اپنے وطن لے گئی۔ اس نے اپنی کتاب میں ان پھولوں اور پودوں کی فہرست بھی دی ہے جو اس نے وادی کشمیر سے حاصل کیے تھے۔

۱۹

جہلم ویلی روڈ

مظفر آباد سرینگر روڈ جسے عرف عام میں جہلم ویلی روڈ کہا جاتا ہے، آج کل عالمی ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز ہے۔ نصف صدی سے زائد عرصے کے بچھڑے ہوئے کشمیری خاندانوں کے ملاپ کے لیے کنٹرول لائین کی دیوار برلن میں ایک ہلکا سا شگاف ڈال کر مظفر آباد سرینگر بس سروس کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کنٹرول لائین پر پانچ مزید کراسنگ پوائنٹس بھی بنائے گئے ہیں جہاں سے نصف صدی سے بچھڑے ہوئے خاندان کڑے فوجی پہرے، گولیوں کی گھن گرج اور سنگینوں کے سائے میں باہم ملاقات کر سکیں۔ یوں صیاد نے اسیروں کو قفس کی تیلیوں سے باہر جھانکنے کی اجازت دی ہے۔

جہلم ویلی روڈ کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ سری نگر اور راولپنڈی کے درمیان 200 میل لمبی یہ سڑک اس وقت ایک پختہ سڑک ہے جسے چکوٹھی کے مقام پر کنٹرول لائن نے دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اس سڑک کا راولپنڈی سے کوہالہ تک 64 میل کا علاقہ پاکستانی حدود میں ہے۔ کوہالہ سطح سمندر سے 1900 فٹ بلند ہے اور یہی اس سڑک کی کسی ایک مقام پر سطح سمندر سے کم سے کم بلندی ہے۔ کوہالہ سے سری نگر کا فاصلہ تقریباً 133 میل ہے۔ بارہ مولا سے سری نگر تک کا 34 میل کا ٹکڑا بالکل ہموار، کشادہ اور دو رویہ سایہ دار چنار کے دیوہیکل درختوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہی وہ ٹکڑا ہے جس

کے بارے میں ای۔ایف۔نائٹ کا کہنا ہے کہ ''یہ دنیا کی خوبصورت ترین سڑکوں میں سے ایک ہے''۔سری نگر راولپنڈی روڈ کی اہم ترین خوبی یہ ہے کہ وادی کشمیر کو باہر کی دنیا سے ملانے والی مختصر ترین سڑک ہونے کے علاوہ ہر موسم میں قابل استعمال ہے۔وادی کشمیر بلند و بالا اور برف پوش پہاڑوں میں ڈھکی ہوئی ہے۔صرف بارمولا سے دریائے جہلم ان بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان سے اپنا راستہ بناتا ہوا وادی سے باہر ایک قدرتی راستہ فراہم کرتا ہے۔یہ سڑک اسی دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی ہے۔یہی واحد قدرتی درہ ہے جو کشمیر پر برسنے والے یا اس سرزمین سے ابلنے والے پانی کے ہر قطرے کو وادی سے باہر نکلنے کے لیے دریائے جہلم کی صورت میں اور وادی کشمیر کو باہر کی دنیا سے ملانے کے لیے جہلم ویلی روڈ کی صورت میں ایک قدرتی راستہ (Outlet) فراہم کرتا ہے۔

پہلے یہ ایک طویل پگڈنڈی تھی۔ایک طرف عمودی پہاڑی کھائی اور دوسری طرف بل کھاتا......... شور مچاتا......... جھاگ اڑاتا دریا......... وادی کشمیر جانے یا وہاں سے واپسی کے لیے مسافروں کو بارہ مولا سے کوہالہ تک اسی طرح کے جانکسل مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔کہیں اوپر سے پتھر لڑھکنے کا خوف اور کہیں پاؤں پھسل کر آن واحد میں دریا کی شوریدہ سر موجوں کا نوالہ بننے کا ڈر۔یہی وجہ ہے کہ جنت ارضی کے مسافر اس راستے پر سفر کرنے کا کم ہی حوصلہ رکھتے تھے۔بیرن چارلس ہیوگل نے سری نگر سے مظفر آباد تک اسی راستے پر سفر کیا تھا اس پکڈنڈی کی کشادگی کا کام 1878ء میں شروع ہوا۔ریاست کے محکمہ پبلک ورکس نے پانچ سال کے عرصے میں صرف 22 میل ٹکڑا کشادہ کیا۔اس کے بعد یہ کام مسٹر سپینڈنگ (Mr.Spedding) نامی ایک ماہر تعمیرات کے سپرد کیا گیا جس نے باقی ماندہ حصہ دو سال کے عرصے میں مکمل کر لیا۔لیکن اس کشادگی کے باوجود اسے آٹوموبائل ٹرانسپورٹ کے قابل بننے کے لیے مزید کئی مرحلوں سے گزرنا تھا کیونکہ اس کی

کشادگی کے بعد بھی محض دو پہیوں والے تانگے کے چلنے کے قابل ہو سکتی تھی۔

1900ء کے لگ بھگ اس سڑک کی کشادگی کا کام دوبارہ مسٹر سپڈ نگ کی تعمیراتی کمپنی کے حوالے کیا گیا۔ چند سال کی جہد مسلسل سے یہ سڑک آٹو موبائل ٹرانسپورٹ کے قابل ہو سکی۔ 1940ء کے عشرے میں اس سڑک کے پہلو بہ پہلو ریلوے لائین بچھانے کا منصوبہ بنا۔ اس کا ٹھیکہ بھی سپڈ نگ اینڈ کمپنی کو دیا گیا تھا۔ منصوبہ پر کام کا آغاز ہونے سے قبل ہی 1947 میں تقسیم ہند اور اس کے ساتھ ہی جنم لینے والے قضیہ کشمیر نے خطے کا منظر نامہ ہی تبدیل کر دیا۔ یوں راولپنڈی سری نگر ریلوے لائین کا منصوبہ خواب سے حقیقت کا روپ نہ دھار سکا۔

۲۰

کشمیر کی تنہا مسافر

مارگریٹ موریسن

1904ء میں مس پاربری اور مس ڈوہٹی کی روح نے ایک اور خاتون سیاح کا روپ دھار کر کشمیر کی سیاحت کی۔ یہ نو وارد مارگریٹ کاٹر موریسن تھی جو گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے سری نگر آئی تھی۔ اس نے اپنی روداد سفر A lonely Summer in Kashmir کے نام سے لکھی ہے۔ ہر چند کہ وہ ہرگز تنہا کشمیر نہیں آئی تھی بلکہ ایک دوست بھی اس کے ہمراہ تھی (یا تھا) جونہی وہ سری نگر پہنچے، اس کے ہم سفر کو ایک ٹیلی گرام موصول ہوا جس میں اس کے حکام نے اسے فوری طور پر واپس طلب کیا تھا۔ یوں اسے مس موریسن کو سری نگر میں تنہا چھوڑ کر واپس ہندوستان جانا پڑا۔ اپنے (یا اپنی) ساتھی کی روانگی کے بعد مارگریٹ موریسن نے سری نگر میں منشی باغ میں اپنے دوسرے ہم وطن انگریزوں کے ساتھ ہی رہائش اختیار کرنے کا سوچا لیکن یہ سوچ کر اس نے اس خیال کو ترک کر دیا کہ انگریز تو اسے ہندوستان اور انگلستان میں ہر جگہ بہت مل جائیں گے لیکن کشمیر اسے اور کہیں نہیں ملے گا۔ چنانچہ اس نے تنہا ہی کشمیر کے اطراف و اکناف میں گھوم پھر کر موسم گرما گزارنے کا ارادہ کر لیا۔

اس نے ایک کشتی کرائے پر لی۔ یہی اس کا مسکن بھی تھا اور مرکب (سواری) بھی اس کے سفر و حضر کی ساتھی.........! سری نگر میں مختصر قیام کے بعد وہ اسی کشتی کے.........

ذریعے دریا کے بہاؤ کے مخالف چلتے چلتے اسلام آباد (اننت ناگ) پہنچ گئی۔ وہاں سے اس نے گھوڑا کرائے پر لیا اور اچھابل کے مغلیہ دور کے باغات اور مارتنڈ کا ہندو مندر دیکھنے چلی گئی۔ اس نے اسلام آباد کے گردونواح میں پھیلے ہوئے مختلف باغوں، مرغزاروں اور دوسرے قابلِ دید مقامات کی سیر بھی کی۔

اسلام آباد واپسی پر اس نے اپنی کشتی پھر کھونٹے سے کھولی اور اس میں سوار ہو کر خود کو دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا۔ کیونکہ واپسی کا سفر دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ تھا اور کشتی دریا کی پرسکون سطح آب پر نیم خوابیدگی کے عالم میں بہے چلی جا رہی تھی۔

آغاز سفر میں اس نے بھی اپنے پیشرو بعض سیاحوں کی طرح اپنے آرام و آسائش اور آرائش و زیبائش کا کثیر سامان ساتھ رکھا تھا۔ اس سامان میں ایک ڈائننگ ٹیبل، مطالعے، کھانے اور آرام کی الگ الگ کرسیاں، کپڑوں سے بھرے سوٹ کیس، کھانے پکانے کے برتن اور سنگھار باکس سے لے کر ہیٹ سٹینڈ تک سبھی کچھ شامل تھا۔ لیکن چھٹیوں کے اختتام تک وہ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ چکی تھی۔ چنانچہ وہ لکھتی ہے:

"اس دل افروز سیاحت کے دوران جلد ہی مسافر کو احساس ہو جاتا ہے کہ ہاتھوں کی اوک سے بہترین پیالے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ بازو سے سرہانے اور نرم و ملائم سبزے سے بچھونے کا......... نیند سے بیدار ہونے کے لیے کسی الارم کی ضرورت نہیں۔ صبح ہوتے ہی پرندے خوبصورت سریلی آواز میں نغمے الاپ کر آپ کو جگا دیں گے......... مجھے کشمیر کے اس تنہا سفر کے دوران کوئی خوف و خطرہ محسوس نہیں ہوا، جیسا کہ تنہا خواتین کو نہایت مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں میں بھی خطرات لاحق ہوتے ہیں۔"

مادرِ فطرت کی آغوش میں اس نے جو عرصہ بھی کشمیر میں گزارا اس کا ایک ایک لمحہ سہانا.........ایک ایک منظر دلفریب اور ایک ایک دن یادگار ہے۔ تاہم وہ قلیوں، گائیڈوں، ترجمانوں اور اس قسم کے دوسرے پیشہ ور لوگوں سے بہت تنگ ہے جو سیاحتی مقامات پر گدھوں کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں اور کسی غیر ملکی سیاح کو دیکھتے ہی اس پر پل پڑتے ہیں۔ مس موریسن ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے تاکہ اس کے اور فطرت کے درمیان کوئی حائل نہ رہے۔

اسلام آباد کا دریائی سفر مکمل کرنے اور اچھابل اور مارتنڈ کی سیاحت کے بعد وہ وادی لدر کی طرف نکل گئی۔ اس نے پہلگام میں اپنا خیمہ نصب کیا اور اس خوبصورت تفریحی مقام کی سیر و سیاحت سے لطف اندوز ہونے لگی۔ پہلگام میں اس وقت مسافروں کو سودا سلف اور اشیائے ضرورت فراہم کرنے کے لیے دو تین دکانیں تھیں۔ ایک لیٹر بکس بھی دیودار کے ایک طرف درخت سے لٹک رہا تھا تاکہ جس غریب الوطن کو دیارِ غیر میں اپنے عزیزوں کی یاد ستائے، خط لکھ کر اس لیٹر بکس میں ڈال دے۔ اس امید پر کہ خدا نے چاہا اور محکمہ ڈاک وتار کے حکام کو گوارا ہوا تو کسی دن اس کا یہ خط سات سمندر پار اس کے عزیزوں تک پہنچ جائے گا......... کہ امید پر تو دنیا قائم ہے۔

مس موریسن نے جونہی پہلگام کے ایک گوشے میں اپنا خیمہ نصب کیا۔ ایک مشنری پادری نے جو پہلے سے وہاں قریب ہی پہنچ چکا تھا، اپنا ایک ہرکارہ اس کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اس کے خیمے میں ہر اتوار کو دعائیہ سروس منعقد ہوتی ہے لہذا اس میں شریک ہونا نہ بھولے۔ اس پادری کو کھٹکا تھا کہ مبادا وہ فطرت کی آغوش مہربان میں رہ کر اپنے آبائی مذہب تثلیث سے بے گانہ نہ ہو جائے اور دینِ فطرت (اسلام) ہی کی پرستار نہ بن جائے۔ سچ ہے جو شخص فطرت سے اس قدر قریب رہ کر بھی دینِ فطرت سے دور رہے،

اس کی بد قسمتی پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔ چار ہفتے اس نے پہلگام میں قیام کیا۔ اس کے بعد وہ تارسر جھیل سے ہوتی ہوئی براستہ لدروٹ سری نگر واپس آ گئی۔ سری نگر میں اسے ایک نئی دوست مل گئی۔ اسکی نئی دوست ایک انگریز ڈاکٹر خاتون تھی جو بند میں مقیم تھی۔

سری نگر میں اس بار بھی مس ماریسن کا قیام انتہائی مختصر رہا کیونکہ یہاں شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ دوسرے سیاحوں کی طرح اس نے بھی ایک بار پھر سری نگر کو اور اپنی اس نئی دوست کو خدا حافظ کہا اور چل سوچل گلمرگ کے لیے روانہ ہوگئی۔ اس دور میں سری نگر سے گلمرگ کی طرف جانے والی سڑک کا ٹنگمرگ کے پاس تین میل کا ٹکڑا ابھی تک تعمیر نہیں ہوا تھا۔ چونکہ یہ حصہ خطرناک عمودی چٹانوں پر مشتمل تھا اور یہاں سے پہاڑ کاٹ کر راستہ بنانا اس دور میں کارکوہ کنی سے کم نہ تھا اور کشمیر میں نہ کوئی شیریں تھی، نہ فرہاد کہ یہ پہاڑ اور سنگلاخ چٹانیں کاٹ کر جوئے شیر نہ سہی ایک گزرگاہ ہی بنا سکتا۔ لہذا اس تین میل فاصلے کو جا بجا لکڑی کے تختے لگا کر پاٹا گیا تھا اور لکڑی کی ایک گزرگاہ بنادی گئی تھی۔ کشمیر کے دیہات خصوصاً کپواڑہ کے دور دراز کے علاقوں بارہ مولا کی تحصیل گریز اور ڈوڈا کے ضلع میں ایسی گزرگائیں اب بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ جہاں زمینی راستہ نہ ہونے کے باعث لکڑی کے تختے جوڑ کر گزرگاہیں بنائی گئی ہیں۔ لیکن آج سے ایک سو سال پہلے کی یہ طویل گزرگاہ واقعی دیکھنے کی چیز ہوئی ہوگی۔ جس کا تذکرہ مسز موریسن نے اس قدر دلچسپی سے کیا ہے۔ ایک سو سال پہلے کا گلمرگ کیسا ہوا ہوگا۔ میں موریسن نے اس کی تصویر کشی کی ہے۔

''میرے دائیں طرف ریزیڈنسی ہے، بائیں طرف ڈاک کا بنگلہ،، سامنے دو میل یا اس سے کچھ زیادہ رقبے پر پھیلے ہوئے سرسبز ہرے بھرے میدان ہیں۔ جن میں تہذیب و ترقی کے متعدد آثار پائے جاتے ہیں۔ سب سے نمایاں عمارت مہاراجہ کا محل ہے۔ بیرک نما گھر درہ اور بدصورت محل اور اس کے سامنے ایک چھوٹا سا چرچ ہے۔ (جس کا تذکرہ قبل

ازیں تفصیل سے آ چکا ہے اور یہ کشمیر میں تعمیر ہونے والا دوسرا چرچ ہے۔ پہلا سری نگر میں تعمیر ہوا تھا) سامنے کے ہرے بھرے میدان میں ایک پولوگراؤنڈ اس طویل وعریض میدان اور مختلف عمارتوں کے وسط میں اور ہر جگہ سے یہ یکساں طور پر قابل رسائی ہے۔ قریب ہی بے ترتیبی سے بنا ہوا ایک ہوٹل ہے۔ جو مختلف عمارات پر مشتمل ہے۔ ان سب کے اردگرد سادہ سی لکڑی کی بنی ہوئی جھونپڑیاں ہیں۔ ان کی حالت جھگیوں سے کچھ ہی بہتر ہوگی۔ لیکن موسم گرما میں ان کے مالکان ان کا بھاری کرایہ وصول کرتے ہیں۔

مس موریسن کے نزدیک گلمرگ فراز کوہ پر واقع فطرت کی ایک ایسی مہربان آغوش ہے جہاں انسان زندگی کی تلخیاں غم اور دکھ اکثر بھول جاتا ہے۔ جب مس موریسن گلمرگ میں خیمہ زن تھی سارے ہندوستان سے گرمی کے ستائے ہوئے لاتعداد انگریز افسر اور حکام گلمرگ میں جمع تھے اور یہ ہل سٹیشن ایک چھوٹے سے انگلستان کا منظر پیش کر رہا تھا۔

مس موریسن کے مطابق گلمرگ میں کھانے کی دعوت میں جانا بھی ایک دلچسپ اور عجیب وغریب تجربہ ہے۔ مہمان کو پالکی میں سوار کر کے آگے پیچھے سے دو کہار پالکی کو اٹھا لیتے ہیں اور ایک آدمی لکڑیاں جوڑ کر بنائی گئی مشعل (جسے پہاڑی زبان میں ''مٹھا'' کہا جاتا ہے) لیے آگے آگے چل رہا ہوتا ہے۔

اگست کے آخر تک وہ گلمرگ کی رومان پرور فضاؤں اور حیات آفریں مناظر سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ اس کے بعد اس نے وادی سندھ کی سیاحت کا ارادہ کیا اور انگریز سیاحوں کے سفر وحضر کے انتظامات کرنے والی کمپنی ''کاک برن'' کو آرڈر دے دیا کہ وہ اپنا ایک نمائندہ کیمپنگ کے ساز وسامان سمیت اس کے ساتھ بھیجے۔ اگرچہ گلمرگ میں اس کی دوست نے اسے تنہا وادی سندھ کے سفر پر جانے کا خطرہ مول لینے سے منع کیا تھا لیکن وہ تو سدا کی سفر نصیب تھی۔ دھن کی پکی اور خطرات کو انگیخت کرنے والی۔ دوست احباب کے

پند ونصائح اسے اس جنون سے باز نہ رکھ سکے اور وہ بالاخر اس پرآشوب سفر پر روانہ ہوگئی۔

نالہ سندھ کی وادی میں چلتے چلتے وہ بالاخر سونامرگ پہنچ گئی۔ سونامرگ کے برف پوش اور فلک بوس پہاڑ اس کی متجسس اور فطرت پرست طبیعت کی تسکین کا بھاری سامان اپنے پہلو میں رکھتے تھے۔ چٹانوں کی سختی، پہاڑوں کی بلندی، سبزہ کی لہک، پھولوں کی مہک، بلبل کی چہک اور......... بہت کچھ......... وہ اس رومان پرور ماحول میں کھوگئی۔ راستے کی تلخی اور سفر کی دشواری اب اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھی۔ وہ فطرت کی آغوش میں دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔

یہاں سے آگے وہ اس راستے پر ہولی۔ جو اس زمانے میں کشمیر کی وادی کو وسط ایشیاء سے ملاتا تھا۔ تجارتی قافلے زمانہ قدیم سے ان ہی راستوں پر چلتے رہتے تھے۔ وہ آگے بڑھتی رہی۔ اب دو پہاڑوں کے درمیان دریا کے ساتھ ساتھ آڑے ترچھے........، بل کھاتے راستے پر اس کا سفر جاری تھا۔ حد نظر تک، بنجر اور ویران پہاڑ .... سبزہ و گیاہ سے محروم .... اور یہاں وہاں بکھرے ہوئے ریگستانی قطعات........ فطرت کے پرستاروں کے لیے ایک نیم صحرائی اور نیم کوہستانی منظر بھی قلب وروح کو مہمیز دینے والا ہوتا ہے۔

اس خطرناک سفر میں اس کی ہمسفر وہ ٹیلی گرافک لائن تھی جو اس وادی سے گزرتی تھی۔ اس وحشت کے عالم میں اسے اس بے جان اور بے زبان تار کا ساتھ بھی بڑا غنیمت معلوم ہوتا تھا اور وہ اسے اپنا ہمراز، مونس اور غمخوار سمجھتی تھی۔ اسے اس تار کے وجود سے اطمینان ہوتا تھا کہ اسے راستے میں کسی حادثے کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اس تار کے ذریعے ایک برقی پیغام سری نگر پہنچا سکے گی۔ جہاں سے اس کی مدد کے لیے کوئی قافلہ پہنچ آئے گا۔ وادی سندھ میں کچھ عرصہ جادہ پیمائی کے بعد وہ واپس سری نگر روانہ ہوئی۔ واپسی

پر اس نے ہرامکھ کے دامن میں وادی ایرن (Erin valley) کی مختصر سی سیاحت بھی کی۔ یہاں سے وانگٹ میں دو قدیم مندروں کے آثار دیکھنے کا موقع ملا۔ جو اب امتدادِ زمانہ کی نذر ہو چکے تھے۔ رات اس نے ہرامکھ کی چوٹی سے کشمیر کی وادی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تو اسے وادی کشمیر پر حقیقت سے زیادہ کسی ماہر مصور کی بنائی ہوئی ایک خوبصورت پینٹنگ کا گمان ہوا۔ سچ ہے یہ اس خالق کائنات کے حسن تخلیق کا ایک شاہکار ہے۔ جس کے ننانوے ناموں میں سے ایک نام ''المصور'' بھی ہے یہ اسی مصور کی کاری گری اور مہارت ہے.........!

یہاں اسے رات گزارنا پڑی۔ اس یخ بستہ فضا میں جہاں درجہ حرارت برائے نام ہوتا ہے، اسے اس قدر سردی لگی کہ وہ کہتی ہے کہ اس کا فوم کا گدا منجمد ہو کر برف کی سل میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جیسے تیسے کر کے اس کی رات کٹ ہی گئی۔ اور دوسرے دن وہ سری نگر کے لیے روانہ ہوگئی۔ سری نگر پہنچ کر اس نے اپنا سامان باندھنا شروع کیا۔ اب اس کی سیاحت کشمیر کا مشن تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ وہ اس بات پر نازاں تھی کہ اس نے کشمیر کی تنہا سیر کے چیلنج کا جواب دے دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک فاتح سمجھ رہی تھی۔ سری نگری میں اس نے اپنے دوست واحباب اور عزیزوں کے لیے تحفے خریدے۔ پیپر ماشی کے ڈیلر اور یورپی سیاحوں کے پسندیدہ کردار سفرنگ موسس سے اس نے پیپر ماشی کے کچھ نئے نمونے خریدے اور واپسی کے لیے تیار ہوگئی۔

یہ سری نگر میں اس کی آخری شام تھی۔ اس نے سری نگر کے ایک ایک منظر کو اپنی آنکھوں کے راستے دل میں اتارا۔ کلب ہاؤس کے صحن میں دیودار کے درختوں کی ٹہنیاں جھک جھک کر دریائے جہلم کے آب رواں کے بوسے لے رہی تھیں۔ پری محل کے قمقمے جھیل ڈل کے پانیوں میں منعکس ہو رہے تھے۔ شکارے سیاحوں کو اپنے سینوں سے

چمٹائے ڈل کی نیلگوں سطح آب پر فراٹے بھرتے پھر رہے تھے۔ جھیل کی سطح پر تیرتے ہوئے دیوہیکل ہاؤس بوٹ کے مکین دن بھر کی آوارہ گردی کے بعد اپنے اپنے ہاؤس بوٹس میں واپس آ چکے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھنے کا موقع اسے باردگر ملنے کی توقع نہ تھی، اس لیے وہ ان تمام مناظر کو اپنے من میں جذب کر لینا چاہتی تھی۔ دوسری صبح وہ سری نگر راولپنڈی کارٹ روڈ (جہلم ویلی روڈ) کے راستے برطانوی ہند روانہ ہو گئی۔

۲۱

قوس قزح کے رنگ

جموں وکشمیر عجیب وغریب سرزمین ہے جو دنیا کے تین اہم جغرافیائی خطوں جنوبی ایشیاء، وسط ایشیاء اور جنوب مشرق ایشیاء کو آپس میں ملاتی ہے۔اس ریاست میں دنیا کے تین اہم ترین پہاڑی سلسلے، کوہ ہمالیہ، کوہ قراقرم اور کوہ ہندوکش بھی باہم بغل گیر ہوتے ہیں۔نوآبادیاتی دور کی تین اہم سلطنتیں برطانوی ہند، چین اور روس کی سرحدیں بھی اس ریاست میں آ کر آپس میں ملنے لگتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مشہور برطانوی سیاح ای۔ایف نائٹ، جس نے انیسوی صدی عیسوی کے آخری عشرے میں کشمیر کا سفر کیا، نے اپنے سفرنامے کا نام ہی ,, جہاں تین بادشاہتیں ملتی ہیں ,, "Where Three Empires Meet" رکھا۔

ای۔ایف نائٹ نے 1891ء میں کشمیر کا سفر کیا۔26 فروری 1891ء کی ایک کہر آلودہ شام کو انگلستان کے ساحل سے روانہ ہو کر 23 مارچ کو اسکا جہاز بمبئی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ جب وہ اپنے وطن سے روانہ ہوا تھا تو سارا براعظم یورپ برف کی سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑے انسانی جسم میں خون منجمد کر رہے تھے۔لیکن جب اس نے بمبئی کے ساحل پر قدم رکھا تو گرمی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔

یورپ کی یخ بستہ زمستانی ہواؤں سے نکل کر ہندوستان کی جھلسا دینے والی گرم ہواؤں تک اس کا سفر نیلے پانیوں اور نیلے آسمان کے درمیان گزرا تھا۔

بہرحال بمبئی پہنچ کر بغیر وقت ضائع کیے اس نے اپنی اگلی منزل کی جانب سفر شروع کر دیا کیوں کہ اسے ایک برفستان سے دوسرے برفستان تک جانا تھا۔ جبرالٹر کو خدا حافظ کہہ کر اس کی اگلی منزل ہمالیہ تھی بمبئی اور دوسرے مقامات تو محض راستے کے پڑاؤ تھے، جہاں اس نے ذرا ستانے یا دم لینے کو قیام کرنا تھا۔ اس سفر میں اس کا رفیق چارلس سپڈنگ تھا۔ یہ وہی چارلس سپڈنگ ہے جس کی تعمیراتی کمپنی سپڈنگ اینڈ کمپنی نے راولپنڈی سری نگر روڈ کی تعمیر اور کشادگی کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ چارلس سپڈنگ کا دورہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ اس اہم سڑک کے علاوہ بھی ہندوستان میں بہت سی اہم سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کے ٹھیکے اس کمپنی کے پاس تھے۔ 15/اپریل 1891ء کو یہ دونوں دوست راولپنڈی پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن سے وہ سیدھے دھن جی بھائی کے پاس پہنچے جو ایک خوش اخلاق اور ملنسار پارسی تھا۔ وہ ڈاک اور مسافروں کا ساز و سامان اور دوسری اشیائے ضرورت کشمیر بھجوانے کا ٹھیکیدار تھا۔ دھن جی بھائی سے ہی انہیں معلوم ہوا کہ راولپنڈی سے سری نگر کا فاصلہ 225 میل ہے۔ جو 48 گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ اس وقت کشمیر کے راستے ابھی تک کئی فٹ برف سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ جب تک وہ ناشتے اور غسل وغیرہ سے فارغ ہوتے دھن جی بھائی نے ان کے سفر کے انتظامات کر لیے تھے۔ ان کا قافلہ ایک ٹانگے جس پر وہ اور سپڈنگ سوار تھے اور ایک اکے (Ekkah) جس پر ان کا سامان سفر لدا ہوا تھا پر مشتمل تھا۔ اس اکے کے بارے میں نائٹ کا خیال یہ تھا کہ پہیے کی ایجاد کے ساتھ ہی جو گاڑی ہندوستان میں وجود میں آئی ہوگی وہ یہی اکا ہوا ہوگا۔

ان کا قافلہ مری کی بل کھاتی تنگ سڑک پر آج کی برق رفتاری کے مقابلے میں

کچھوے کی رفتار سے رینگ رہا تھا۔ دیودار کے بلند و بالا درخت، سبزہ، پھول، اونچی نیچی وادیاں......... یہ سارا منظر ان برطانوی سیاحوں کو اٹلی سے ملتا جلتا لگ رہا تھا۔ راولپنڈی کے میدان سے مری کی بلندیوں تک اور مری کی بلندیوں سے کوہالہ کی پستی تک ان کا سفر خطرات سے پر تھا۔ کبھی سڑک کسی اژدھے کی طرح بل کھاتی ہوئی ہزاروں فٹ کی بلندی تک چلتی جاتی اور کبھی اس شان بے نیازی سے لہراتی ہوئی پستیوں میں اتر جاتی۔ یوں کوہ مری کو عبور کر کے وہ دریائے جہلم کی وادی میں داخل ہوئے اور کوہالہ کا معلق پل انہوں نے سواریوں سے اتر کر عبور کیا۔ کوہالہ اس وقت نائٹ کے الفاظ میں چھوٹا سا گندا بازار تھا۔ یہاں مہاراجہ کشمیر کی طرف سے ایک کسٹم ہاؤس بھی تعمیر کیا گیا تھا جو نائیٹ کے خیال میں صرف ''صاحب لوگوں'' کو تنگ کرنے کے لیے بنایا گیا تھا کسٹم ہاؤس کا عملہ روائتی کشمیری فیرن میں ملبوس تھا۔ کسٹم کے قوانین اور قواعد انگریزی اور فارسی زبان میں لکھ کر باہر آویزاں کیے گئے تھے لیکن کسٹم کے اہلکار دونوں زبانوں کو سمجھنے سے عاری تھے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان میں بات کرتے تھے جو ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ بالاخر تلاشی کے بعد کسٹم اہلکاروں نے چھ فیصد کسٹم مانگا۔ اس استفسار کا کہ انہوں نے سامان کی مالیت کا کیا اندارہ کیا ہے جس پر وہ چھ فیصد کسٹم ڈیوٹی عائد کر رہے ہیں، ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

انھوں نے بحث کا رخ موڑتے ہوئے کہا کھلاڑیوں اور سیاحوں کے لیے کسٹم میں چھوٹ ہے لیکن تاجروں کے لیے نہیں۔ لہذ اسپڈ نگ کو انہوں نے تاجر قرار دے کر اس سے پورے ٹیکس کا مطالبہ کر دیا۔ بہر حال مزید بحث و تکرار کے بعد وہ انہیں اس شرط پر چھوڑنے پر آمادہ ہوئے کہ حکام بالا سے رابطہ کے بعد ان کے سامان پر کسٹم ڈیوٹی کا تعین کیا جائے گا پھر ادائیگی ہوگی۔

یہاں سے نائٹ اور سپڈنگ سری نگر کے لیے روانہ ہوئے۔ اب وہ دریائے جہلم

کے دائیں کنارے عمودی پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی تنگ سی سڑک پرواں دواں تھے۔ یہ علاقہ نائٹ کو بہت اچھا لگا۔ اس زمانے میں شاید اس علاقے میں کھیتی باڑی پر بڑی توجہ دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے دھان کے کھیتوں اور دوسری فصلوں کا ذکر کیا ہے۔ جو اس علاقے میں کثرت سے کاشت کی جاتی تھیں۔

کوہالہ سے چل کر پہلی رات انہوں نے دلائی کے ڈاک بنگلہ میں قیام کیا۔ یہی وہ ڈاک بنگلہ ہے جو اب دلائی کیمپ کے نام سے مشہور ہے۔ اور جہاں آزاد کشمیر پولیس کی نفری قیام پزیر ہے۔ یہ اس زمانے کا جدید اور سہولتوں سے آراستہ ڈاک بنگلہ تھا۔ مہاراجہ کشمیر نے سری نگر سے کوہالہ تک مناسب فاصلے پر اس قسم کے ریسٹ ہاؤس تعمیر کروار کھے تھے۔

دوسرے دن وہ دلائی سے چل کر بمشکل دومیل پہنچ پائے اور دومیل کے ڈاک بنگلہ میں قیام کیا۔ یہ ڈاک بنگلہ دریائے جہلم اور نیلم کے سنگم کے قریب واقع تھا اور خوبصورت محل وقوع کا حامل تھا، جہاں سے جہلم اور نیلم کی وادیوں کا بیک وقت نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ دریائے جہلم پر لوہے کا پل لگ گیا تھا۔ جو مسٹر Atkison نے لگایا تھا جو اب بھی قائداعظم برج سے تھوڑے فاصلے پر اصل حالت میں موجود ہے۔ اگلی صبح ناشتے کے بعد نائٹ اس پل کو عبور کر کے بازار کی سیر کو چلا گیا۔ اس پل کے پائے تراشید پتھروں کے بنے ہوئے تھے.......... ہندوؤں کے لیے اس پل نے ایک مقدس عمارت یا مندر کی حیثیت بھی اختیار کر لی تھی کیونکہ اس کے پایوں کے پتھروں میں کچھ مورتیاں بھی تراش کر نصب کی گئی تھیں۔ قریب ہی دریائے کشن گنگا اب دریائے نیلم پر بھی لکڑی کا ایک معلق پل تھا جو اب شکستہ ہو کر ناقابلِ عبور ہو چکا تھا۔

دومیل میں سپڈنگ کی ملاقات جنرل ڈی بوربل (Gen De-borebel) سے ہوئی جو ریاست کا چیف انجینئر تھا۔ سپڈنگ چونکہ اس تعمیراتی فرم کا مالک تھا۔ جس نے

جہلم ویلی کی روڈ تعمیر کرنا تھی لہذا اگلے چند دن ان کی باہمی گفت وشنید میں گزر گئے اور سپڈنگ کے ساتھ ساتھ نائٹ کو بھی مظفر آباد میں ہی قیام کرنا پڑا۔ مظفر آباد میں طلوع آفتاب کے وقت اسے ایک بڑا قافلہ ملا جو وسط ایشیاء سے تجارتی سامان لیکر براستہ یارقند کشمیر میں داخل ہوا تھا اور اب کشمیر کے پہاڑی سلسلوں سے گزر کر ہندوستان میں اس سامان کو فروخت کرنے کے لیے جا رہا تھا۔ اس سامان میں مصالحہ جات، چمڑے کی مصنوعات، اونی ملبوسات اور دوسرا سامان تھا۔ قافلے کے مرد وخواتین چینی ترکستان کے باشندے تھے جن کے گول گول چہرے اور سرخ اور سفید رنگت اسے بہت بھلی معلوم ہوئی۔

دومیل کے قریب ہی سکھوں کی بستی بھی تھی۔ اسی دوران 12 اپریل کا دن آ پہنچا جو ان کے مذہبی تہوار کا دن تھا۔ قرب و جوار، بلکہ دور دراز کے علاقوں سے بھی سکھ مرد و خواتین بڑی تعداد میں اس مقدس تہوار میں شرکت کے لیے یہاں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے دریائے جہلم میں غسل کیا اور خوشی کا یہ دن کھیل تماشے میں گزارا۔ نائٹ اس تہوار سے بھی جی بھر کر لطف اندوز ہوا۔ لیکن اس تہوار میں سب کچھ لطف اندوز ہونے کے قابل ہی نہ تھا۔ کچھ اس کے برعکس بھی تھا۔ افیون کے نشے میں بدمست کچھ سکھ ایک ٹولی کی شکل میں جمع تھے۔ ان کے ننگ دھڑنگ اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے جسم، سر اور داڑھی کے الجھے ہوئے بال ان کے سیاہ چہروں کو اور بھی زیادہ ہیبت ناک بنا رہے تھے۔ وہ نائٹ کو گھور گھور کر دیکھنے لگے جس سے نائٹ کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔

یہیں دومیل کے ڈاک بنگلے میں سترھویں بنگال کیولری کا کیپٹن باوئر (Capt.Bower) بھی آ گیا اور تینوں برطانوی باشندے باہم گھل مل گئے ۔ کیپٹن باوئر اس سے قبل بھی وسط ایشیاء کے متعدد سفر کر چکا تھا۔ وہ نئے نئے راستوں اور نئی منزلوں کا متلاشی تھا۔ اس کی وجہ شہرت اس کا وہ تاریخی سفر تھا جو اس نے لداخ سے شنگھائی

تک کیا تھا۔اب وہ جانب کشمیر گامزن تھا تا کہ وہاں سے وہ لداخ کا بارِ دگر سفر اختیار کر سکے۔اس نے نائٹ کو بھی دعوت دی کہ وہ چین کی سرحد تک اس کی رفاقت اختیار کرے ۔نائٹ نے خوشی سے یہ دعوت قبول کر لی۔اگلے دن 13 اپریل کو یہ دونوں بنجارے سپڈنگ اور دوسرے انجینئروں کو خدا حافظ کہتے ہوئے اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہوئے کیونکہ سپڈنگ ایک معروف تعمیراتی کمپنی کا مالک تھا جبکہ نائٹ اور باوئر کو تعمیرات سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔وہ پہاڑوں کی چوٹیوں، دریاؤں کی روانی، پھولوں کی مہک اور سبزے کی لہک سے لطف اندوز ہونے والے فطرت پرست لوگ تھے۔مظفرآباد سے روانگی کے وقت انہوں نے سپڈنگ کی کمپنی کے ایک ملازم کو بھی ہمراہ لیا۔تا کہ وہ اوڑی میں سپڈنگ کے تعمیر کردہ گیسٹ ہاؤس میں ان کے قیام وطعام کا بندوبست کر سکے۔تانگے کا یہ سفران سیاحوں کے لیے بھی ویسا ہی تکلیف دہ تھا جیسا قبل ازیں دوسری خواتین سیاحوں کے تذکرہ میں آ چکا ہے۔اسی طرح کا اناڑی کوچوان اس تنگ اور بل کھاتی سڑک پر تانگے کو یوں بگٹٹ دوڑا رہا تھا جیسے فضاء میں جہاز اڑ رہا ہو۔بیچارے نائٹ اور باوئر کی جان پر بنی ہوئی تھی۔راستے میں ایک جگہ وہ موڑ کاتے ہوئے دریا کی شوریدہ سرلہروں کی نذر ہونے سے بال بال بچے۔اس طرح ایک جگہ برساتی نالہ اپنا رخ تبدیل کرتے ہوئے بلندی سے آبشار کی صورت میں سڑک کے عین بیچ میں گر رہا تھا جس کے نیچے سے یہ سیاح نہاتے ہوئے گزرے تاہم اس سفر میں سب سے خوفناک تجربہ بلکہ جسارت جو بقول نائٹ کے، سری نگر سنٹرل جیل میں انہیں عمر قید کی سزا کاٹنے پر مجبور کر سکتی تھی وہ یہ تھی کہ ان کا تیز رفتار ٹانگہ سر راہے سوتی ہوئی گائے کے اوپر سے گزر گیا۔وہ تو خیر گزری کہ گائے کو معمولی زخم آئے ورنہ ہندو حکمران کی ریاست میں جہاں گائے کو دیوی کا درجہ حاصل تھا، ان کی یہ جسارت انہیں زندگی بھر کے لیے جیل کی تنگ وتاریک کوٹھریوں میں دھکیل سکتی تھی یا انہیں سزائے موت سے ہمکنار کر سکتی

تھی۔ کیونکہ ریاست میں اس جرم کی یہی سزا تھی۔

اوڑی میں سپڈنگ نے اپنا ایک ڈاک بنگلہ تعمیر کروا رکھا تھا۔ نائٹ اور اس کا ہمسفر چند روز یہاں قیام پذیر رہے یہاں ان کی ملاقاتیں روزانہ اپنے ہم وطن سیاحوں سے ہو جاتی تھیں۔ کیونکہ ریاست میں یہ سیاحت کا موسم تھا اور یورپی سیاح مسلسل وادی کا رخ کر رہے تھے۔ چند روز بعد سپڈنگ بھی اوڑی پہنچ گیا۔ دریں اثناء تاج برطانیہ کا نمائندہ اور نو تعینات شدہ حبشی نژاد برطانوی ریزیڈنٹ کرنل پرائیوڈیوکس(Colonel Priodeaux) اپنی بیوی کے ہمراہ براستہ جہلم ویلی اوڑی پہنچ گیا۔ وہ دن کا کھانا کھانے تھوڑی دیر کے لیے مسٹر سپڈنگ کے ڈاک بنگلے میں رکا تھا۔ مقامی آبادی کو جب پتہ چلا کہ ملکہ برطانیہ کا نیا نمائندہ ان کے ہاں تشریف فرما ہے۔ وہ فرمانبردار اور اطاعت شعار رعایا کی حیثیت سے ڈاک بنگلے میں اس کا استقبال کرنے پہنچ گئے۔ اپنے روائتی لباس میں ملبوس یہ سینکڑوں لوگ برطانوی ریذیڈنٹ کی ایک جھلک دیکھنے اسے اپنی وفاداری کا یقین دلانے اور اسے تحفے تحائف پیش کرنے جمع ہوئے تھے۔ ان تحائف میں خشک میوہ جات، قریبی دریا سے پکڑی گئی تازہ مچھلی، تازہ پھل اور دوسری اجناس شامل تھیں۔ یہاں قلعے میں تعینات مہاراجہ کے باوردی اور مسلح سپاہیوں نے بھی "صاحب بہادر" کو گارڈ آف آنر پیش کیا۔ یہ جگہ مظفرآباد کے مقامی حکمران کی سلطنت میں تھی جو اب بڑھاپے کی دہلیز قدم رکھ چکا تھا۔ خوبصورت خوش شکل اور خوش لباس یہ مقامی حکمران اور اس کے آباؤاجداد ڈوگروں کے تسلط سے پہلے اس علاقے کے بے تاج بادشاہ تھے۔ لیکن اب ان کی مطلق العنان حکمرانی قصہ ماضی بن چکی تھی۔ اب وہ محض برائے نام حکمران رہ گیا تھا کیونکہ حکمرانی کے اختیارات ڈوگرہ مہاراجہ کو منتقل ہو چکے تھے۔

24 ر اپریل کو نائٹ اور اس کا ساتھی اوڑی سے بارہ مولا کے لیے روانہ ہوئے

جہاں سے انہیں بقیہ سفر بیل گاڑی کے بجائے کشتی پر طے کرنا تھا۔آج کا دن ان کا چھکڑے پر سفر کا آخری دن تھا۔وہ سیب، ناشپاتی، خوبانی، چیری، اور انگور کے پھلدار درختوں کے پاس سے گزرتے رہے اور اس ارضی جنت نظیر کی خوبصورتی اور فطرت کی فیاضی کا بنظر عمیق جائزہ لیتے رہے۔ کشمیر کی سرزمین میں یہ سب پھل خودرو ہیں جو اپنے ذائقے نفاست اور معیار کے اعتبار سے دنیا کے کسی بھی حصے میں کاشت کیے جانے والے پھلوں سے زیادہ لذیذ ہیں ان کے سامنے حد نظر تک پھیلے ہوئے سبزہ زار تھے جو ان کے قلب وروح کی تسکین اور نظر کی ٹھنڈک کا باعث بن رہے تھے۔ان سبزہ زاروں میں جا بجا گلہائے رنگا رنگ اپنی بہار دکھا رہے تھے جیسے سبز مخملیں قالین پر ترتیب اور سلیقے کے ساتھ مختلف رنگوں کی گلکاری کی گئی ہو۔یہ سب کچھ انہیں کسی تصوراتی دنیا کا منظر لگ رہا تھا۔جیسے کوئی شخص خواب کے عالم میں کسی پرستان میں پہنچ جائے جہاں ہر طرف رنگ ہی رنگ ہوں، پھول ہی پھول ہوں، مہک ہی مہک ہو، سبزہ ہی سبزہ ہو، اور وہ سب کچھ جس کا محض تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔لیکن یہ تو ان کے تصورات اور تخیلات سے بھی بڑھ کر حسین سرزمین تھی۔اس سرزمین کے پہاڑ بھی انہیں جمال و جلال کے پیکر لگ رہے تھے۔ سفید برف سے ڈھکے ہوئے سبز مخملیں پہاڑ......... نائیٹ کہتا ہے کہ ایسے خوبصورت پہاڑ میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھے۔راستے میں جگہ جگہ بلندی سے گرتی ہوئی آبشاروں کا منظر بھی حسین تھا۔نائیٹ کشمیر کی خوبصورتی پر ان الفاظ میں رطب اللسان ہے۔

" It was a land of running waters, of fruits, of flowers, of birds, and of sweet odours that made one think that the beauties of far famed Kashmir had not been exaggerated by the ancient poets"

وہ اگرچہ مہاراجہ کی ریاست سے گزر رہے تھے لیکن ابھی تک وہ وادی کشمیر میں قدم نہیں رکھ پائے تھے۔ بارہ مولا کے مقام پر دونوں طرف کے پہاڑوں کی بلندی کم ہوتے ہوتے معدوم ہو جاتی ہے۔ یہاں سے دریائے جہلم اپنا راستہ بناتا ہوا وادی کو خیر آباد کہہ کر تنگ دروں میں داخل ہو جاتا ہے۔

بارہ مولا وادی کشمیر کا گیٹ وے ہے۔ یہاں سے سری نگر تک دریا کے دونوں طرف چاول کے کھیت اور سیبوں کے باغات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بارہ مولا سے سری نگر کا زمینی فاصلہ تو بتیس میل کا ہے لیکن اس دور میں زیادہ تر آمدورفت دریائے جہلم کے راستے کشتی کے ذریعے ہوتی تھی۔ نائیٹ اور اس کے ہمسفروں نے اپنی ضرورت کے پیش نظر متعدد کشتیاں جنہیں ڈونگے کہا جاتا ہے کرائے پر لیں کیونکہ اوڑی سے مسٹر سپڈنگ اور اس کا قافلہ بھی دوبارہ ان کے ساتھ آملا تھا جس سے ایک بھاری بھر کم قافلہ وجود میں آ گیا تھا۔

ہانجی

ہانجی یا کشتی ران کشمیر میں ایک الگ طبقہ ہیں جو پشت ہا پشت سے کشتی رانی کے ذریعے اپنا رزق کماتے ہیں۔ نائیٹ نے انہیں نہایت مہذب شائستہ اور خوش لباس بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق بیشتر ہانجی مسلمان ہیں۔ جو ان ہندوؤں کی اولادیں ہیں جو اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے تھے۔ روانگی سے قبل نائیٹ اور اس کے ہمسفروں نے بارہ مولا میں گھوم پھر کر اس شہر کا جائزہ لینے کا پروگرام بنایا۔ اس وقت کا بارہ مولا ایک چھوٹا سا روائتی کشمیری قصبہ تھا جو دریائے جہلم کے صرف دائیں کنارے پر آباد تھا۔ اس کی چھوٹی اور تنگ و تاریک گلیاں گندگی سے پر تھیں۔ بارش کا پانی اکثر ان میں جمع رہتا تھا۔ دھوپ میں خشک کی گئی گارے کی کچی اینٹوں کے بنے ہوئے چھوٹے

مکانات تھے جن میں ظلم وستم کے مارے ہوئے غربت وافلاس کا شکار کشمیری آباد تھے۔ مٹی کی چھتیں اوران پراگی ہوئی گھنی اور لمبی گھاس اس بستی کے مکینوں کی خستہ حالی اور درماندگی کی نشاندہی کررہی تھی۔ مکانات کی چھتوں پراگنے والی اس خودروگھاس بھوس میں بھی اتنی شادابی اور رنگارنگی تھی کہ نائٹ نے انہیں بھی آرائشی پودہ جات اور پھول سمجھا اور ستم ظریفی یہ کہ اس نے کشمیریوں کی اس تیرہ بختی کوان کے شوق باغبانی سے تعبیر کرکے اس کی تعریف کی ہے۔ آبادی سے ملحق دریائے جہلم پر آرچوں کا بنا ہوا پل تھا۔ پل کے ساتھ ہی ایک قلعے کے کھنڈرات تھے جو 1885ء کے زلزلے سے تباہ وبرباد ہو گیا تھا۔ اوراب اس کے آثار ہی باقی تھے۔

بارہ مولا قصبے کی سیر کرنے اور گردوپیش کا جائزہ لینے کے بعد نائیٹ اوراس کے ساتھی اپنے سفر کی اگلی منزل کی جانب روانہ ہوگئے۔ دریائے جہلم کی سطح آب پران کا کشتیوں کا قافلہ دریا کے بہاؤ کے مخالف سمت میں رواں دواں تھا۔ ان کے دونوں جانب رنگ ونور میں ڈوبی، خوشبو میں رچی بسی، صانع حقیقی کی صناعی کا ایک حسین شاہکار، وادی کشمیر تھی۔ جس کے نظارے سے وہ جی بھر لطف اندوز ہورہے تھے۔ دریا کے کنارے بنے ہوئے سرکاری گیسٹ ہاؤس میں انہوں نے کچھ دیر قیام کیا۔ اس گیسٹ ہاؤس میں مچھلیوں کے شکار کے شوقین برطانوی صاحب لوگ قیام کرتے تھے اور جی بھر کے ماہی گیری کے مشغلے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ نائیٹ نے دیکھا کہ اس گیسٹ ہاؤس کی دیواروں پر کوئلے سے ان صاحب لوگوں نے اپنے اپنے کارناموں کی داستانیں باتصویر رقم کررکھی تھیں اور ہر آنے والے نے پہلے والے سے بڑی مچھلی کے شکار کا دعویٰ کیا تھا۔ حتیٰ کہ ایک من چلے انگریز نے تو ایک ایسی دیوہیکل مخلوق کے شکار کا دعویٰ کیا، بلکہ کوئلے سے اس کی تصویر بھی بنائی تھی جس کے بارے میں نائیٹ کا خیال ہے کہ ایسی دیوہیکل اور عجیب الخلقت

مخلوق بحراوقیانوس میں بھی مشکل ہی سے پائی جاتی ہوگی۔

ایک خوفناک طوفان

اب ان کا قافلہ دریائے جہلم کے بہاؤ کے مخالف سمت میں ایک بار پھر رواں دواں تھا۔ ہوا خوشگوار تھی اور موسم بھی ساز گار۔ سورج کی روپہلی کرنیں انہیں بھلی لگ رہی تھیں۔ سفر مزے سے کٹ رہا تھا کہ موسم کے تیور اچانک بگڑنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس حسین اور خوشگوار موسم کی جگہ ایک طوفان نے لے لی۔ کشتیاں سطح آب پر ہچکولے کھانے لگیں۔ پانی کی لہریں اچھل اچھل کر کشتی میں داخل ہونے لگیں۔ ہوا جو کچھ دیر پہلے بڑی مہربان تھی، اب ایک خوفناک دیو کی طرح انہیں کشتیوں سمیت یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں اچھال رہی تھی۔ لیکن یہ طوفان کا ایک جلالی پہلو تھا۔ اس طوفان کا ایک جمالی پہلو بھی تھا۔ وہ یہ کہ آسمان کے کناروں پر سرخ سرخ اور سرمئی رنگ کے بادل خوبصورت مناظر پیش کررہے تھے۔ شفق کے سرخ اور سنہری رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ آسمان پر حد نظر تک کسی نے سونا پگھلا کر پھیلا دیا ہو۔ بادلوں کے اتنے رنگ اور ایسے انداز نائیٹ نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ جلال و جمال کا یہ امتزاج اسے بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ اس شدید طوفان اور منہ زور ہوا میں کشتی چلانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ چنانچہ کشتیوں کو ساحل کے ساتھ کھونٹے سے باندھ کر نائیٹ اور اس کے ساتھی ایک قریبی گاؤں میں چلے گئے۔ وہاں بھی خوف و دہشت کا یہی عالم تھا۔ مرد، خواتین، بچے اور بوڑھے اس طوفان سے ڈرے سہمے گھروں میں دبکے ہوئے تھے سب لوگ اپنے پردوگار سے عافیت اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

قوس قزح کے رنگ

کچھ دیر کے بعد طوفان کا زور ذرا تھما تو نائیٹ اور اس کے ساتھی واپس اپنی کشتیوں میں سوار ہو کر تھوڑی ہی دیر میں جھیل ولر پہنچ گئے۔ ولر کی سطح آب پر طوفان کے اثرات ابھی تک موجود تھے اور پانی میں مدوجزر کی کیفیت برقرار تھی۔ لیکن طوفان کی شدت کم ہو چکی تھی اور ہلکا پھلکا مدوجزر ان کے لیے تفریح طبع کا سامان بن رہا تھا۔ اس طوفان اور بادوباراں کے بعد کا منظر اور بھی حسین ہو گیا تھا۔ وادی کے چاروں جانب کھڑے سر بفلک پہاڑ اب اجلے اجلے اور صاف ستھرے لگ رہے تھے۔ فضا سے گرد و غبار اور دھند ختم ہو چکی تھی اور حدِ نظر تک رنگ و نور میں نہائے ہوئے کوہ و دمن بہت خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ فضا میں مختلف زاویوں سے قوس قزح اپنے رنگ بکھیر رہی تھی۔

سری نگر آمد

26 اپریل کو اس قافلے نے جھیل ولر کو الوداع کہہ کر ایک بار پھر دریائے جہلم کے بہاؤ کی مخالف سمت میں سفر شروع کر دیا۔ بالآخر سری نگر سنٹر جیل اور قلعہ ہری پربت پر ان کی نظر پڑی جو اس بات کی علامت تھی کہ اب ان کا قافلہ سری نگر پہنچ چکا تھا۔ سفر کی ساری تھکاوٹ ہری پربت اور تخت سلیمان کا ایک نظارہ کرنے سے کافور ہو گئی تھی۔ بقول نائیٹ ایک لاکھ کے لگ بھگ آبادی کا شہر سری نگر جس کے لغوی معنی سورج کا گھر یا سورج کی بستی کے ہیں اٹلی کے شہر وینس سے (Venus) سے کسی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ اس کی شہر میں کشتی کے راستے داخل ہونے والا شخص بسا اوقات اپنا راستہ بھول جاتا ہے اور کسی تنگ ندی میں جا نکلتا ہے اور پھر سوچنے لگتا ہے کہ اس عظیم ریاست کا صدر مقام ہونے کے لیے یہ جگہ موزوں ہے بھی کہ نہیں۔

اپنی سفری کشتیوں سے نکل کر تیز رفتار اور خوبصورت ''شکارا'' پر سوار ہوئے تو انہیں ایک عجیب فرحت اور کیف محسوس ہوا۔ شکارا بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا جس میں عمدہ گدے اور گاؤ تکیے لگے تھے، اس خوبصورت شکارے کی سیر سے وہ خوب لطف اندوز ہوئے۔ یہ شکارا بالاخر ایک گھاٹ پر رکا۔ جہاں سے اتر کر انہیں خشکی پر قدم رکھنا تھا۔ گھاٹ پر انسانوں کا ہجوم تھا۔ خواتین گاگریں اٹھائے پانی بھرنے پنگھٹ پر آئی ہوئی تھیں۔ دھوبی کپڑے دھو رہے تھے۔ ہندو اپنی مذہبی رسوم ادا کر رہے تھے، مسلمان وضو کرنے میں مصروف تھے۔ گھاٹ پر اتر کر نائیٹ نے سری نگر شہر میں قدم رکھا۔ یہاں چند لمحے رک کر وہ دریائے جہلم کے کنارے آباد شہر سری نگر کی عمارات پر ایک نظر ڈالتا ہے، وہ کہتا ہے:

''دریا کے دونوں کناروں پر بنے ہوئے مکانات میں سے اکثر فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی دیواریں عمدہ لکڑی کی بنی ہوئی ہیں جن میں اعلیٰ معیار کی کندہ کاری کی گئی ہے۔ دیکھنے میں یہ عمارات عہدِ وسطیٰ کے یورپ کی عمارات کے مشابہ نظر آتی ہیں (یہاں نائیٹ کو شاید اس حقیقت کا علم نہیں یا اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے کہ عہد وسطیٰ کے یورپ کے فن تعمیر اور طرز بود و باش پر خود کشمیری تہذیب و ثقافت کے بڑے گہرے اثرات ہیں جن کا ذکر قبل ازیں ''لالہ رخ'' کے ضمن میں کیا جا چکا ہے)

اسے شکوہ ہے کہ مہاراجہ کشمیر نے ایسا قانون بنا رکھا ہے کہ کوئی یورپی باشندہ کشمیر میں زمین نہیں خرید سکتا حتیٰ کہ سری نگر کے رہائشی علاقے میں اپنا مکان نہیں بنا سکتا۔ اگر قبل ازیں اس نے کوئی مکان تعمیر کر لیا ہو تو ایک لمحے کے نوٹس پر اسے بے دخل کیا جا سکتا ہے کیونکہ کشمیر میں مکانات اور زمین مہاراجہ کی ملکیت ہیں اور یہاں کے باشندوں کی حیثیت محض کاشتکار کی ہے۔ اگرچہ موجودہ حکومت نے منشی باغ میں یورپی باشندوں کی رہائش کے لیے کالونی تعمیر کی ہے لیکن یورپی سیاحوں کی روز افزوں بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے ناکافی ہے۔

نائیٹ جب سے وادی کشمیر میں داخل ہوا ہے، اس خطہ کی خوبصورتی دیکھ کر اس کا دل مچلتا ہے۔ اسے یہ ریاست اٹلی سے مشابہ نظر آتی ہے۔ سری نگر شہر اسے ہو بہو وینس دکھائی دیتا ہے۔ لوگوں کا طرز و بود و باش اسے آئرلینڈ سے ملتا جلتا لگتا ہے۔ عمارات اسے عہدِ وسطیٰ کے یورپ کی یاد دلاتی ہیں۔ الغرض اسے کشمیر میں اپنے وطن کی جھلک نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہ بے اختیار کہتا ہے:

Had we not sold this magnificient country, a great military cantonment would, no doubt, have been long since established here.This would not only have been most advantageous from a strategic point of view, but would have avoided much of the sicknes and the morality which shrinks the ranks of our white army in India.

یوں ای۔ ایف نائیٹ مور کرافٹ، ژاک مونٹ، ہیوگل اور اپنے پیشرو دوسرے سیاحوں کے ہم آواز ہو کر اس ریاست کی فروخت بیعنامہ امرتسر) پر خون کے آنسو بہاتا اور کف افسوس ملتا ہے "لیکن اب بچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت" سیاحوں کا یہ رونا دھونا، للچائی ہوئی نظروں سے وادی کے حسن و جمال کو دیکھنا اب بے سود تھا کیونکہ ڈوگرہ خاندان کی گرفت اب بہت مضبوط ہو چکی تھی انگریز اب اس کے شکنجے سے اس فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عالمی حالات و واقعات خصوصاً پہلی اور دوسری جنگ عظیم نے برطانیہ کا وہ بھرکس نکال دیا کہ اسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور کشمیر کے حصول کا خواب تحلیل ہو کر رہ گیا تھا۔

لارنس کے ہمراہ

دن بھر نائیٹ چنار باغ میں گھومتا پھرتا اور اس کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا

رہا۔شام کا کھانا اس نے برطانیہ کی طرف سے مقرر کردہ آفیسر بندوبست مسٹر لارنس کے ساتھ کھایا۔کھانے کی میز پر مسٹر لارنس نے اسے پیش کش کی کہ وادی کشمیر کے سرکاری دورے میں وہ اس کے ہمراہ چلے۔نائیٹ نے اس پیش کش کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر قبول کر لیا۔اگلے کئی روز اس نے مسٹر لارنس کے ساتھ کشمیر کے طول و عرض میں گھوم پھر کر گزارے اور سیاحت سے جی بھر کر لطف اندوز ہوا۔اب اسے سفر کھانے پینے اور رہائش کی کوئی فکر نہ تھی کہ وہ آفیسر بندوبست کے عملے میں شامل تھا۔اس نے مسلمانوں، سکھوں اور پنڈتوں سے ملاقاتیں کیں، ڈوگرہ حکام سے تبادلہ خیال کیا، جھیلوں، باغوں اور مرغزاروں کی سیر کی۔ ڈوگروں کے انداز حکمرانی، ریاست کے باشندوں کی مظلومیت اور وادی کے حسن و جمال کا بنظر غائر مشاہدہ کیا اور اپنے محسوسات کو بتفصیل قلمبند کیا۔سری نگر شہر کے حسن و جمال پر وہ اس قدر فریفتہ ہو گیا کہ جگہ جگہ اس شہر کی خوبصورتی اور وینس سے اس کی مشابہت کا تذکرہ چھیڑ دیتا ہے۔مزید ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"But I must speak a view which I enjoyed one morning from Takht-e-Suleman. It is a view that no traveller should miss it.I looked down on the many windings of the river and the numberous canals traversing the Asiatic Venice with its temples and glittering mosques and gardens roofed tarraces, alllaying beneath me like a plain. There beyond, spread the irrigated plains with flooded rice fields, stood a smaller but the most beautiful Dal Lake.

یہاں اسے بھی دیگر سیاحوں کی طرح مغلیہ دور کے کشمیر کے پس منظر میں تخلیق کی

گئی رومانوی نظم ,,لالہ رخ،،یاد آجاتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ اگر میں نے کشمیر کو نہ دیکھا ہوتا تو ''لالہ رخ'' کی قدر و قیمت سے آشناء نہ ہوسکتا ۔یقیناً ''لالہ رخ'' ایک شاہکار کتاب ہے۔ جسے فطرت کے اس عظیم شاہکار وادی کشمیر کے پس منظر میں تخلیق کیا گیا تھا۔

۲۲

کشمیر میں پچاس سال

زمانہ قبل مسیح سے شروع ہو کر 1947ء تک کے جنت ارضی کے سیاحوں کے سلسلے کی آخری کڑی سر ریورنڈ ٹنڈل بسکو ہے جس نے نصف صدی سے زائد عرصہ کشمیر میں گزارا اور یہاں کی بہار و خزاں اور روز و شب کو ہر رنگ میں دیکھا۔ پستہ قامت ٹنڈل بسکو برطانیہ کے ایک متمول گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ وہ 1863ء میں پیدا ہوا۔ ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود اس کا بچپن مصائب و آلام سے پر گزرا۔ سب سے پہلے اس کا واسطہ ایک ایسی آیا سے پڑا جو آیا ہونے کے ساتھ ساتھ بدروحوں کو بھگانے کا بھی دعویٰ کرتی تھی۔ چنانچہ اس نے ٹنڈل بسکو کو بھی جن بھوت نکالنے کے بہانے مار مار کر ادھ موا کر دیا لیکن جن تھا کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا لہذا بیچارہ بسکو ناقابلِ بیان تشدد سہتا رہا۔ ذرا بڑا ہوا تو اسے بریڈ فیلڈ سکول میں داخل کرا دیا گیا جس کے اساتذہ اور بچے عجیب و غریب عادتوں کا شکار تھے۔ مار پیٹ اس سکول کی پہچان تھی اور یہ مار پیٹ صرف اساتذہ کی طرف سے بچوں ہی کی نہیں ہوتی تھی بلکہ کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا تھا۔ اکثر طاقتور طلباء کمزور طلباء کو مشق ستم بنائے رکھتے تھے۔ بسکو بیچارہ تھا ہی کمزور لہذا سب سے زیادہ مار پیٹ اس کے حصے میں آئی۔ بریڈ فیلڈ میں گزارے ہوئے پانچ سال کو وہ خود

"Five Years in hell" (جہنم میں پانچ) سال کا نام دیتا ہے۔

پے در پے ستم سہتے سہتے اس کی فطرت ایسی بن گئی کہ اس میں رحم اور ہمدردی کے جذبات موجزن ہو گئے جو تا زیست اس کی فطرت ثانیہ بنے رہے۔ کمزوروں اور بے بسوں کے لیے تڑپ اٹھنا اور سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں پالے رکھنا اس نے شاید ان ہی حالات سے سیکھا تھا۔ لہذا اسے آج بھی انسانیت کے ایک بہت بڑے خادم کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔

کشمیر کے بارے میں لاعلمی

ٹنڈل بسکو نے کیمرج سے عیسائیت کی مذہبی تعلیم حاصل کی اور اپنے آپ کو مسیحیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ اپنے پیشرو دوسرے مشنریوں کے طرح، جن کا تفصیلی ذکر گزشتہ ابواب میں ہو چکا ہے وہ بھی دکھی انسانیت کی خدمت اور غلامی اور ظلم اور جبر کے مارے ہوئے نادار انسانوں کی مدد کے لیے افریقہ جانا چاہتا تھا۔ لیکن برطانیہ کی مشنری سوسائٹی نے اس کی تقرری کشمیر میں کر دی۔ اسے مشنری سوسائٹی کے اس فیصلے پر بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ وہ کشمیر کے محل وقوع اور نام تک سے بھی واقف نہ تھا۔ ایسی ایک انجانی دنیا میں وہ اپنے مذہب اور انسانیت کی کیا خدمات بجالا سکے گا؟ وہاں کا ماحول اسے راس آسکے گا؟ اسے وہاں کے لوگوں کا مطلوبہ تعاون مل سکے گا؟ یہ اور اس طرح کے بے شمار سوالات تھے جو اس کے ذہن پر ہتھوڑے بن کر برس رہے تھے۔ پھر وہ کشمیر کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کرنے رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کے دفتر گیا جہاں سے اسے کچھ بنیادی معلومات حاصل ہوئیں۔

مشن سکول کی حالت زار

کشمیر میں وہ مشن سکول سری نگر کا پرنسپل بن کر آیا تھا۔ پہلی رات اس نے منشی باغ میں اپنے ہم وطن ڈاکٹر آرتھر نیو کے ساتھ گزاری (ڈاکٹر نیو کا تفصیلی تذکرہ گزشتہ صفحات میں آچکا ہے)۔ اگلی صبح وہ دریائے جہلم کے کنارے واقع لکڑی کی عمارت میں جا پہنچا۔ یہ مشن سکول کی عمارت تھی۔ سکول میں اس نے پرنسپل کو حاضری رپورٹ دی۔ اس سے چارج لین دین کرنے کے بعد اس نے سکول کا معائنہ کیا۔ لکڑی کے ننگے فرش پر قطار در قطار پڑی ہوئی بوریوں پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے ذرا غور سے دیکھا تو وہ جنہیں بوریاں سمجھتا تھا وہ بوریاں نہیں فیرن میں لپٹے ہوئے ننھے منے معصوم طلباء تھے جو سردی کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لیے فیرن میں کانگڑیاں چھپائے اکڑوں بیٹھے تھے۔ سکول کا کوئی باوقار یونیفارم نہ تھا۔ نہ طلباء کے لیے آرام دہ کلاس روم نہ فرنیچر.......... اور نہ پرنسپل اور سٹاف کے لیے مناسب دفاتر۔ سارا سکول ایک یتیم خانے کا ایک منظر پیش کر رہا تھا۔ سکول کی اس قابل رحم حالت کو دیکھ کر اسے بریڈ فیلڈ کا سکول یاد آ گیا جس میں اس نے پانچ سال تک تعلیم کے نام پر قید با مشقت کاٹی تھی۔ جلدی ہی بسکو پر یہ خوف ناک انکشاف ہوا کہ مشن سکول سری نگر کی ظاہری حالت ہی بریڈ فیلڈ سکول سے نہیں ملتی بلکہ اس ادارہ کے اساتذہ اور طلباء بریڈ فیلڈ سکول کے طلباء و اساتذہ بھی کی طرح بری عادت کا شکار تھے۔ شہر کے اوباش لوگ ان بچوں کو اپنی مذموم خواہشات کی تکمیل کے لیے ہوسٹل سے اٹھا کر لے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی سکول کے بچے ان تمام برائیوں کا شکار تھے جن کی کسی بگڑے ہوئے معاشرے میں توقع کی جا سکتی ہے۔ چوری، مکاری، خود غرضی، بددیانتی، اور اس قسم کی تمام برائیاں ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئیں تھیں۔ اس مسخ شدہ فطرت کے حامل بچوں کو انسانیت کے دائرے میں لانا ٹنڈل بسکو کے لیے سب سے بڑا چیلنج تھا۔ یہ وہ حالات تھے

جن میں ٹنڈل بسکو نے مشن سکول سری نگر کا انتظام سنبھالا۔

اس وقت مشن سکول سری نگر میں زیر تعلیم تمام طلباء ہندو تھے۔ مسلمان معاشی طور پر اس قابل تھے ہی نہیں کہ کسی جدید اور معیاری ادارے میں اپنے بچوں کو تعلیم دلاسکیں (جہاں مشن سکول کے معیار کا یہ عالم تھا، وہاں عام سکولوں کی کیفیت کیا ہوئی ہوگی، اندازہ کیا جاسکتا ہے)۔ بسکو مجبور ومظلوم انسانیت کی خدمت کا جذبہ لیکر کشمیر آیا تھا۔ لیکن اسے یہاں اس لحاظ سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ یہاں مظلوم کے بجائے ظالم آقاؤں کے بچوں کی تعلیم وتربیت دینے پر مامور کردیا گیا تھا۔ ظلم اور ظالم سے نفرت اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لہذا اس نے اس عزم کے ساتھ ہی ادارے کی سربراہی سنبھالی کہ وہ غریب اور مجبور مسلمان اکثریت کے بچوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لے گا۔

بسکو کی اصلاحات

مشن سکول کی سربراہی سنبھالنے کے بعد ٹنڈل بسکو نے ادارہ میں وسیع پیمانے پر اصلاحات کیں۔ اس نے تدریسی نصاب سے بائبل کی تعلیم کا بھاری بھرکم حصہ کم کردیا اور مسیحیت کی تعلیم وتبلیغ دعائیہ سروسز کے سخت معاملات میں بھی بڑی حد تک کمی کردی۔ وہ ایک پادری ہونے کے باوجود بڑا حقیقت پسند اور معتدل مزاج شخص تھا۔ وہ مذہب کے معاملے میں زبانی جمع خرچ کی بجائے مذہب کی اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار کی پاسداری پر یقین رکھتا تھا۔ اس نے طلباء کی کردار سازی اور اخلاقی تعلیم وتربیت پر زیادہ زور دیا کیونکہ اخلاقیات تمام آسمانی مذاہب کی بنیاد ہیں۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ طلباء کی اخلاقی تعلیم اور تربیت کے بغیر ان میں انسانی خوبیاں نہیں پیدا ہوسکتیں۔ اس نے طلباء کی کردار سازی کا ایک جامع نظام تشکیل دیا جس کی بنیاد خدمت پر رکھی اس نے اپنے طلباء کو ابتدائی طبی امداد، آگ پر قابو

پانے، سیلاب سے متاثرہ افراداور خاندانوں کی بحالی، غریبوں اور محتاجوں کی امداداور دوسری
سماجی خدمات کی تربیت دی اور ان میں اس خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا کیا تا کہ اس کے
ادارے سے فارغ التحصیل طلباء محض سول اور فوجی بیورو کریسی کے کل پُرزے نہ بن جائیں
بلکہ وہ سچے خادم خلق اور خادم انسانیت بھی بن سکیں۔

یہاں پہلے پہل ٹنڈل بسکو کو اپنے اس منصوبے پر عمل درآمد میں بے پناہ
مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ادارہ کے طلباء جو نہ تو کسی انسانی خوبی یا اخلاقی وصف کے حامل تھے
نہ کسی نظم ونسق اور قاعدے ضابطے کے پابند نہ تھے، ایسی مربوط اور انسانی مقاصد سے ہم آہنگ
اصلاحات کے سانچے میں آسانی سے ڈھلنے کو تیار نہ تھے۔ وہ مزاحمت پر اتر آئے نوبت
ہڑتال اور توڑ پھوڑ تک جا پہنچی لیکن ٹنڈل بسکو بھی اپنی دھن کا پکا تھا۔ اس نے طلباء کو مار پیٹ
کر اور چھڑی سے ہانک کر کمروں میں بند کر دیا۔ اور ان کی سرزنش کا عمل اس وقت تک
جاری رکھا جب تک وہ اس کی پالیسی پر عمل کرنے پر تیار نہیں ہو گئے۔ انسانوں کے بگڑے
ہوئے بچوں کو سدھانا، درندوں کے بچوں کو سدھانے سے بھی زیادہ دشوار تھا۔ لیکن اس کے
نزدیک یہ ناممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی پالیسوں کو مناسب حکمت عملی اور مستقل مزاجی
سے نافذ کیا اور طلباء کی مزاحمت رفتہ رفتہ دم توڑ گئی۔

مخالفتیں

تعلیمی اور سماجی اصلاحات کے اس ہمہ گیر اور دوررس نظام کی مخالفت ادارے
کی طلباء ہی کی طرف سے نہ تھی بلکہ پادریوں سے لیکر ریاستی حکام تک ہر طبقہ اپنی اپنی وجوہ
کی بناء پر اس نظام کی مخالفت پر کمر بستہ تھا۔ پادریوں کو ٹنڈل بسکو پر یہ اعتراض تھا کہ وہ طلباء
کو بائیبل کی تعلیم اور دعائیہ سروس کے بجائے کھیل کود اور سماجی سرگرمیوں کی طرف راغب کر
رہا ہے جو ان کے نزدیک غیر متعلق تھیں۔ انہوں نے بسکو کی ان حرکات کی شکایت بارہا

برطانیہ کی مشنری سوسائٹی سے بھی کی۔ ہندوستان اور کشمیر میں تعینات یورپی حکام ٹنڈل بسکو کی ان اصلاحات کے اس لیے مخالف تھے کہ وہ ایسا کر کے محکوموں کو رمز شاہی سکھانے یا ممولوں کو راہ و رسم شاہبازی سکھانے کے جرم کا مرتکب ہو رہا تھا۔ یہ حقیقت ہے جب غلاموں پر اسرار شہنشاہی کھل جاتے ہیں تو وہ آقاؤں کے خیموں کی طنابیں کاٹ کر ایک عہدِ نو کی بنیاد رکھ دیتے ہیں۔ غلاموں کی یہ باغیانہ روش آقاؤں کو کب گوارا ہوتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان اور کشمیر میں تعینات صاحب لوگوں نے بسکو کے ان حرکات کی بھرپور مخالفت کی۔

کشمیری مسلمان تو بیچارے کسی شمار و قطار میں تھے ہی نہیں اور نہ ہی ان کی طرف سے بسکو کی اصلاحات کی حمایت یا مخالفت سے کوئی خاص فرق پڑ سکتا تھا۔ وہ بیچارے تو تھے ہی بے بس، بے کس اور بے زبان مخلوق جنہیں غم دوراں اور غم روزگار سے فرصت ملتی تو کچھ سوچتے، البتہ برہمنوں نے بسکو کے تعلیمی نظام کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا کیونکہ اس نئے نظامِ تعلیم سے ذات پات، اونچ نیچ اور ظلم و ستم پر مبنی برہمنوں کا سارا سماجی ڈھانچہ خطرے سے دوچار ہو گیا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اس نئی روشنی سے توہمات پر مبنی ہندو دھرم کی عمارت آن واحد پر زمین بوس ہو جائے گی لہذا وہ بسکو کی مخالفت میں سب سے آگے تھے۔ ریاست کی ڈوگرہ حکومت بھی محکوم عوام کی تعلیم و تربیت کے اس معیاری نظام کو اپنے اقتدار کے لیے خطرے کا سگنل سمجھ رہی تھی لہدا وہ بسکو کے راستے میں روڑے اٹکانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔

ان ہمہ گیر اور ہمہ نوع مخالفتوں کے طوفان کے باوجود ٹنڈل بسکو نے مستقل مزاجی سے اپنے تعلیمی اور سماجی ایجنڈے پر کام جاری رکھا۔ اس پر تین مرتبہ قاتلانہ حملے بھی ہوئے لیکن وہ ہر بار زندہ سلامت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ پے در پے قاتلانہ حملوں کے پیش نظر اس نے اپنے سرہانے پستول رکھنا شروع کر دیا اور اپنی رہائش گاہ ہلٹن کاٹیج کے

باہر کسی بھی مداخلت کی اطلاع دینے والا ایک خود ساختہ نظام نصب کردیا جو ٹین کے ڈبوں اور تاروں پر مشتمل تھا۔ کوئی بھی شخص اس کی رہائش گاہ کے احاطے میں داخل ہونے کی کوشش کرتا تو تاروں سے لٹکے ہوئے ٹین کے یہ ڈبے بجنا شروع ہو جاتے اور پستول تھامے مقابلے کے لیے تیار ہو کر باہر نکل آتا۔

انسانی حقوق کا محافظ

یہ تھے وہ حالات جن میں ٹنڈل بسکو نے اصلاحات کے وسیع اور ہمہ گیر پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کا اصلاحی پروگرام صرف ادارہ کے تعلیمی نظام اور طلبہ میں سماجی خدمت کا شعور پیدا کرنے تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ وہ ظلم و ناانصافی کے ہر شکل اور ہر قسم کے خلاف شمشیر برہنہ بن جاتا تھا۔ ایک دن وہ اپنی کلاس میں درس و تدریس میں مصروف تھا کہ سکول کا ایک استاد دوڑتا ہوا کلاس روم میں داخل ہوا اور اسے اطلاع دی کہ چند اوباش نوجوان ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی کو اس کی والدہ سے چھین کر ایک بدکاری کے اڈے کی طرف زبردستی لے گئے ہیں۔ بسکو نے فوری طور پر اپنے طلبہ کو بھیج کر متذکرہ اڈے کا محاصرہ کرالیا اور خود سائیکل پر سوار ہو کر جلدی تھانے پہنچ گیا جہاں سے وہ فوری طور پر پولیس کو لے کر اس اڈے پر پہنچ گیا۔ پولیس نے مظلوم لڑکی کو برآمد کر کے تمام اوباش افراد کو گرفتار کرلیا۔ یوں بسکو کو حاضر دماغی اور بروقت اقدام سے اس بچی کی عزت لٹنے سے بچ گئی اور غنڈوں کو بھی کیفر کردار تک پہنچالیا گیا۔

ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ ایک بھاری بھر کم شخص ایک مریل سے گدھے پر سوار ہے اور اس کے بوجھ سے گدھے کی کمر دہری ہو رہی ہے۔ اس نے اس دیو ہیکل شخص کو گدھے سے اتار کر بھگایا اور بے زبان مریل گدھے کو اس عذاب سے نجات دلائی۔

روائتی ہندو معاشرے میں عورت کا مقام جانور سے کچھ ہی بہتر تھا۔ اسے

معاشرے میں کوئی اختیار اور مقام حاصل نہیں تھا۔حتیٰ کہ خاوند کے مرنے پر اسے بھی خاوند کے ساتھ زندہ جلنا پڑتا تھا اس رسم کو''ستی''رسم کہا جاتا تھا۔بسکو نے ہندو خواتین میں حقوق کا شعور پیدا کیا اور انہیں ان معاشرتی اور سماجی مظالم کے خلاف آواز اٹھانے پر ابھارا۔ رسم ورواج کے کڑے شکنجے میں کسے ہوئے معاشرے میں اگرچہ ٹنڈل بسکو کی کوششیں کوئی بڑا انقلاب نہ لاسکیں۔تاہم اس نے ہندو عورتوں کو معاشرے کے ان مظالم سے بچانے میں بہتر طور پر اپنا کردار ادا کیا۔

سود کے خلاف جنگ

غربت اور افلاس نے کشمیری عوام کو فاقوں پر مجبور کر رکھا تھا۔ایک طرف حکمران اور ان کا مراعات یافتہ طبقہ تھا دوسری طرف نان شبینہ کے محتاج کشمیری عوام۔اس مفلسی اور تنگ دستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر غریب کشمیری ہندو ساہوکار سے سود درسود قرض لیکر اپنا جسم وجان کا رشتہ برقرار رکھنے پر مجبور تھے۔وہ بھاری شرح سود پر قرضے لینے اور پھر اس پر ساہوکاروں کے ہاتھوں جائیداد اور اپنی نسلوں کو گروی رکھنے پر مجبور تھے۔غریب کشمیری مسلمان سود کی رقم ادا نہ کرسکتا تو اپنی جائیداد ساہوکاروں کے حوالے کر کے خود امرتسر یا لاہور کی طرف محنت مشقت کرنے اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے ہجرت کر جاتا۔کشمیری عوام یہ خستہ حالی ٹنڈل بسکو سے دیکھی نہ جاتی تھی۔چنانچہ اس نے غریب لوگوں کو قرضوں کی لعنت سے چھٹکارا دلانے کے لیے ایک خصوصی فنڈ بھی قائم کیا۔اگرچہ وہ اس ظالمانہ نظام میں کوئی بڑا شگاف ڈالنے میں ناکام رہا لیکن اس کی یہ کاوشیں اس کے اخلاص اور دردمندی کا پتہ دیتی ہیں۔

فنکارانہ صلاحیتیں

پادری ہونے کے باوجود بسکو کو ڈرامہ اور اداکاری کی خاص صلاحیت حاصل تھی۔ مشن سکول میں ہونے والے ڈراموں، خاکوں اور دوسرے دلچسپ پروگراموں کی نگرانی وہ خود کرتا تھا۔ وہ خود طلبہ کو مختلف ڈراموں کے لیے تیار کرتا تھا۔ مہاراجہ کشمیر جب اپنے سرمائی دارالحکومت جموں سے گرمائی دارالحکومت سری نگر آتا تو مشن سکول کے طلبہ سکول کے سامنے اس کا استقبال کرتے اور دریا کے آر پار رسوں کی مدد سے لٹک کر اپنے جسموں سے Wel Come کے الفاظ بناتے۔ مہاراجہ کا دریائی جلوس طلبہ کے جسموں سے بنے ہوئے Wel Come کے اس تاج نما گیٹ کے نیچے سے گزرتا تو ایک عجیب سماں بندھ جاتا تھا۔

1947ء میں ٹنڈل بسکو کی کشمیر میں مشنری اور تعلیمی خدمات کا نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط دور اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس لیے نہیں کہ ہندوستان آزاد ہو کر بھارت اور پاکستان دو آزاد ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور برطانوی اقتدار کا سورج غروب ہو گیا تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی جگہ لینے کے لیے ایک نیا پرنسپل پہنچ گیا تھا اور بسکو یہ سمجھتا تھا کہ مشن سکول میں اس کی موجودگی نئے پرنسپل کے لیے مسائل کا باعث بن سکتی ہے لہذا اس نے کشمیر سے رخت سفر باندھنے کا فیصلہ کر لیا۔ ٹنڈل بسکو اور اس کی اہلیہ بلانچ کو شایان شان انداز میں بڑے احترام اور وقار کے ساتھ کشمیر سے رخصت کیا گیا۔ سکول کے طلبہ اساتذہ نے اپنے اس مربی کو اشکبار آنکھوں سے الوداع کہا اور اس کی پچاس سالہ خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ سری نگر سے تو ٹنڈل بسکو کو شایان شان انداز سے رخصت کیا گیا لیکن اس کا بعد کا سفر خوشگوار نہ رہ سکا کیونکہ تقسیم ہند کا اعلان ہو چکا تھا اور پورا ہندوستان ہندو مسلم فسادات کی زد میں تھا۔

وہ بمبئی سے انگلستان روانگی کی تیاری کر رہا تھا جب اسے کشمیر پر قبائلی حملے کی اطلاع ملی۔ ہندو اخبارات قبائلیوں کی لوٹ مار کی کہانیاں مرچ مصالحہ لگا کر بیان کر رہے تھے۔ ساتھ ہی اسے بھارتی فوج کے سری نگر پہنچ جانے کی خبر ملی جو بھارتی نقطہ نظر سے قبائلی یلغار سے کشمیر کو بچانے کے لیے آئی تھیں۔ اور ساتھ ہی ہری سنگھ کے کشمیر ے سے فرار اور شیخ محمد عبداللہ کے بطور وزیر اعظم تقرری کی خبر بھی اسے بمبئی میں ہی پڑھنے کو ملی۔ شیخ عبداللہ سری نگر میں مشن سکول کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے تھے اور ان کے بچے بھی اسی سکول میں زیر تعلیم تھے، لہذا شیخ عبداللہ کی وزارت عظمٰی پر بسکو کا اظہار اطمینان ایک فطری بات تھی۔ اسی پر بس نہیں بلکہ شیخ صاحب کی پہلی کابینہ کے ارکان کی نصف سے زائد تعداد بھی ٹنڈل بسکو کے شاگردوں کی تھی۔

اپنے قیام کشمیر کے دوران ٹنڈل بسکو مسلمانوں کے متعلق ایک ہمدردانہ نقطہ نظر رکھتا ہے کیونکہ وہ ان کی مظلومیت کا گزشتہ نصف صدی تک بچشم خود مشاہدہ کرتا رہا ہے۔ لیکن بمبئی میں وہ کانگریس کا طرف دار اور مسلم موقف کا ناقد نظر آتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بمبئی میں اس کا واحد ذریعہ معلومات ہندو پریس ہے جو ہندوؤں کے موقف کو یک طرفہ طور پر پیش کر رہا ہے اور ہندوؤں کو مظلوم اور مسلمانوں کو ظالم گردان رہا ہے۔ ٹنڈل بسکو بھی اس یکطرفہ موقف سے متاثر نظر آرہا ہے تاہم وہ زندگی بھر بحثیت مجموعی اپنی غیر جانب دارانہ حیثیت کو برقرار رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب رہا ہے۔

بمبئی سے روانگی کے اٹھارہ ماہ بعد وہ ہورڈیشیا میں وفات پا گیا۔ یوں کشمیر میں اس کی نصف صدی کی تعلیمی اور سماجی خدمات کے خاتمے کے ساتھ ہی اس کی کتاب حیات کا آخری ورق بھی اُلٹ گیا۔

۲۳

گہنایا ہوا چاند

1947ء میں برطانوی ہند کی تقسیم اور بھارت اور پاکستان کی شکل میں دو آزاد مملکتوں کے قیام سے خطہ کا نقشہ ہی نہیں بدلا، صدیوں کی مستحکم قدریں بھی بدل گئیں ____ اخلاقیات کے معیارات اور پیمانے بدل گئے سوچ اور فکر کے زاویے تبدیل ہو گئے ____ صدیوں تک ایک دوسرے کے ساتھ رہنے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شامل ہونے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ تلواریں چمکیں ____ کرپانیں لہرائیں ____ تیر اور بھالے چلے ____ گولیاں برسیں ____ لاشے تڑپے ____ خون کے دریا بہے ____ سارا برصغیر فسادات کی لپیٹ میں آ گیا ____ دونوں ملک ____ انسانی و اخلاقی قدروں کے کفن میں لپٹی ہوئی اور خون میں نہائی ہوئی آزادی کا جشن منا رہے تھے۔ اس خوں رنگ داستان کا ایک اہم باب کشمیر تھا جہاں بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ جموں میں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا گیا۔ اس کے ردّعمل میں پونچھ کے غیور عوام نے جنگِ آزادی کا آغاز کیا اور ایک بڑا علاقہ ڈوگروں کے چنگل سے آزاد کرا لیا ____ پھر صوبہ سرحد کے قبائلی لشکر مظفر آباد کے راستے کشمیر میں داخل ہوئے جن کی لوٹ مار اور قتل و غارت گری کو بہانہ بنا کر بھارت کے کشمیر پر فوج کشی کی۔ یوں دونوں نو آزاد ممالک کشمیر کے محاذ پر ایک دوسرے کے خلاف

برسرِ پیکار ہو گئے۔ مابعد اقوامِ متحدہ کی مداخلت سے جنگ بندی عمل میں آئی اور ریاست آزاد اور مقبوضہ کشمیر میں تقسیم ہو گئی۔ یہ عارضی لکیر، جسے محض سیز فائر لائن کا نام دیا گیا تھا۔ گزشتہ چھ دھائیوں سے ریاست جموں وکشمیر کے سینے پر کالے ناگ کی طرح رینگ رہی ہے ــــــ اس منحوس خونی لکیر نے جنتِ ارضی کشمیر کو ہی دو حصوں میں تقسیم نہیں کر رکھا بلکہ خاندانوں کو بھی منقسم کر رکھا ہے۔

1947ء کے انہی خوں آشام واقعات کے تناظر میں کلکتہ کے مشہور انگریزی اخبار "Statesman" کے ایڈیٹر آئین سٹیفن نے 1952ء میں ایک صحافی کی حیثیت سے آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کا سفر کیا اور HORNED MOON کے نام سے ایک سفر نامہ لکھا۔ Ian Stephen نے 1942ء میں Statesman کلکتہ کی ادارت سنبھالی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب دوسری جنگِ عظیم اپنی تمام تر ہولناکیوں اور قہر مانیوں کے ساتھ جاری تھی۔ کلکتہ اس جنگ سے براہِ راست متاثر تھا۔ ہوائی حملے، بے یقینی، اتحادیوں کی پسپائی اور جاپانیوں کی پیش قدمی کی افوائیں اس دور کے کلکتہ کا معمول تھیں۔ Statesman اگرچہ اتحادی قوتوں کا باقاعدہ ترجمان نہ تھا تاہم صحافتی محاذ پر اتحادی قوتوں کی اہم خدمات بجا لا رہا تھا۔ فوج میں حوصلہ اور مورال برقرار رکھنا اور عوام کو فوج کی پُشت پر لا کھڑا کرنا اخبار کی پالیسی تھی۔ ایک آزاد اخبار ہونے کے ناطے وہ برصغیر کے محکوم اور مظلوم عوام کی آواز بھی۔ برطانوی ایوانوں تک پہنچاتا تھا اور برطانوی حکومت کی پالیسیوں پر تنقید میں بھی پیش پیش رہتا تھا ــــــ آئین سٹیفن کی محنت، لگن اور پیشہ وارانہ مہارت نے اخبار کو وہ "Crediblity" اور مقبولیت دی جو اس سے پہلے اسے حاصل نہ تھی۔ اب یہ اخبار کلکتہ کے علاوہ دھلی سے بھی شائع ہونے لگا تھا۔

1947ء میں تقسیمِ برصغیر کے ساتھ بھی فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی۔ ایک برطانوی صحافی ہونے کی حیثیت سے آئین سٹیفن اپنے اخبار کو ہندو مسلم تنازعہ اور پاک بھارت کشمکش میں غیر جانبدار پالیسی پر گامزن رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن بھارتی قیادت اور ہندو عوام پاکستان دشمنی کے شدید جذبات رکھتے تھے۔ اخبار کا حلقہ قارئین بھی انہی لوگوں پر مشتمل تھا۔ اخبار کی غیر جانبداری کی پالیسی انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور ان کی طرف سے اخبار مسلسل دباؤ کا شکار تھا۔ حتیٰ کہ سیکولر کانگریسی قیادت بھی اخبار کو بھارت نواز اور پاکستان دشمن پالیسی اپنانے پر مجبور کر رہی تھی۔ ابتداء میں آئین سٹیفن کا خیال تھا کہ دونوں ملکوں کے عوام اور قیادت میں ایک دوسرے کے بارے میں نفرت انگیز جذبات وقتی ہیں اور جلد ہی دونوں ایک دوسرے کے دوست بن جائیں گے۔ وہ دونوں ممالک کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور دشمنی ترک کر کے معمول کے تعلقات قائم کرنے پر زور دیتا تھا۔ اسی جذبے کے تحت اس نے بیک وقت کلکتہ اور دھلی کے علاوہ کراچی سے بھی شائع کرنے پر بھی غور شرع کیا تا کہ دونوں ممالک کی حکومتوں کے علاوہ عوام تک بھی اخبار کا نکتہ نظر آسانی سے پہنچ سکے۔

آئین سٹیفن کو صرف ہندو انتہا پسندوں کی طرف سے ہی دباؤ کا سامنا نہ تھا بلکہ یہ اخبار سیکولر کانگریسی قیادت کی آنکھ میں بھی کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ کابینہ کے اراکین اور دیگر عمائدین حکومت بھی ایڈیٹر پر مسلسل دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ غیر جانبداری اور پاکستان سے ایک گونہ ہمدردی کی پالیسی ترک کرتے ہوئے بھارتی نکتہ نظر کی ترجمانی کرے لیکن وہ ہر قسم کے دباؤ کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اس نے آزادی کے بعد چار سال تک انتہائی مشکل حالات میں، بھارتی حکومت اور عوام کے شدید دباؤ کے باوجود اپنے اخبار کی غیر جانبدارانہ پالیسی پر عمل جاری رکھا لیکن اس عرصہ میں وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ نفرت کی

لہر اتنی شدید اور اس کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ شاید اس کی زندگی میں دونوں ممالک ایک دوسرے کے دوست نہ بن سکیں ایسے حالات میں انہیں ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش لا حاصل ہے۔ چنانچہ اس نے Statesman کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنا کیئریر ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اسے ایک دن گورنر جنرل ہاؤس میں دعوت پر بلایا اور پر تکلف کھانے کے بعد اسے اخبار کی پالیسی تبدیل کرنے کا مشورہ دیا۔ لارڈ ماونٹ بیٹن اس کے ذاتی دوست بھی تھے اور سٹیفن نے متعدد بحرانوں میں لارڈ ماونٹ بیٹن کا ساتھ دیا تھا۔ اسے گورنر جنرل کے اس مشورے سے سخت ذہنی اذیت ہوئی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ اب اس کے پاس دو ہی راستے ہیں۔ یا تو وہ لارڈ ماونٹ بیٹن پنڈت جواہر لعل نہرو، کانگریس اور ھندو مہا سبھائیوں کے مشترکہ دباؤ پر اخبار کی پالیسی تبدیل کرلے یا پھر وہ اخبار کی ادارت سے کنارہ کش ہو جائے۔

پہلی صورت میں اس کے لیے اور اس کے اخبار کے لیے فائدے ہی فائدے تھے۔ وہ راتوں رات کانگریس، بھارتی سرکار اور ھندو مہا سبھائیوں کی آنکھ کا تارا بن سکتا تھا۔ اخبار کی سرکولیشن کئی گنا بڑھ سکتی تھی، اسے دھڑا دھڑ سرکاری اور تجارتی اشتہار ملنے شروع ہو سکتے تھے۔ دولت کی ریل پیل ہو سکتی تھی، وہ ہندوستان بھر میں شہرت کے آسمان پر محو پرواز ہو سکتا تھا۔ لیکن ان تمام فوائد کے بدلے اسے صرف ایک معمولی سی قربانی دینی پڑتی تھی ______ اور وہ تھی غیر جانبداری کے صحافتی اصول کی قربانی ______ وہ چاہتا تو عملیت پسندی pragmatism کا سہارا لے کر اصول کی قربانی کو سند جواز عطا کرسکتا تھا لیکن اس نے ایسا کرنا گوارا نہ کیا بلکہ اصول پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اتنے فوائد اور امکانات کو نظر انداز کر کے دوسرے راستے کا انتخاب کیا اور اخبار کی ادارت سے علیحدہ اختیار

کر کے واپس اپنے وطن مالوف (انگلستان) چلا گیا

چند ماہ بعد ۲۲ فروری ۱۹۵۲ء کو وہ ایک بار پھر ہیتھرو ائیر پورٹ پر ایشیاء کی جانب ایک نئے سفر پر روانگی کا منتظر تھا۔ اس مرتبہ اس کی منزل کلکتہ نہیں بلکہ کراچی تھی ______ جی ہاں! وہ تقسیمِ برصغیر کے نتیجہ میں معرضِ وجود میں آنے والی آزاد اسلامی ریاست پاکستان کی سیاحت کرنا چاہتا تھا جس کے حوالے سے ہمدردانہ نکتہ نظر رکھنے کے جرم کی پاداش میں اسے کلکتہ کو خیر باد کہنا پڑا تھا۔ پاکستان میں اس کے ذاتی سٹاف کے کچھ افراد بھی اس کے منتظر تھے جنہیں اس نے اپنی آمد کی اطلاع دی ہوئی تھی۔ ان میں رحیم خان اور محمد انور خان نامی دو پٹھان بھی تھے جو کلکتہ میں اس کے اخبار Statesman میں اس کے ماتحت کام کر چکے تھے۔ اب اس کا جہاز ہیتھرو ائیر پورٹ سے کراچی کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ اس کے نیچے برف میں ڈھکا ہوا اور کہر میں لپٹا ہوا برِ عظم یورپ پھیلا ہوا تھا۔ ماؤنٹ بلانک برف کا سفید لباس پہنے یورپ کے ساحلوں پر اپنا عکس ڈال رہا تھا۔ جزیروں اور ساحلوں کا نظارہ کرتے ریشمی بادلوں سے آنکھ مچولی کرتے اب اس کا جہاز یورپ کی فضاؤں سے نکل کر ایشیا کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ بیروت، قاہرہ، شام کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے صحرائے عرب اور پھر بحیرہ عرب کو عبور کرتے ہوئے بالآخر اس کا جہاز کراچی ائیر پورٹ پر لینڈ کر گیا۔ ائیر پورٹ پر اس کا پرانا ملازم رحیم خان اس کا منتظر تھا۔

پاکستان اگرچہ اس وقت ایک نازک صورت حال سے دوچار تھا جن کا تفصیلی تذکرہ سٹیفن نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ اثاثوں کی تقسیم میں بھارت کی طرف سے پاکستان کو اس کا جائز حصہ نہ دیئے جانے پر پاکستان ابھی تک معاشی عدم استحکام سے دوچار تھا۔ پورے ہندوستان سے مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے اس نوزائیدہ ریاست میں ابھی تک آبادکاری کے منتظر تھے۔ سول ایڈمنسٹریشن ابھی تک ابتدائی مراحل میں تھی۔ قیامِ

پاکستان کے فوراً بعد قائدِ اعظم کی رحلت نے اس ملک کی حیثیت اس یتیم بچے کی سی کر دی تھی جس کی پیدائش کے ساتھ ہی والدین کا سایہ اس کے سر سے اُٹھ گیا۔ ہو، باونڈری کمیشن کی دھاندلی نے پاکستان کے جغرافیہ کی کتر بیونت کر کے اس کے بہت سے علاقے بھارت کے حوالے کر دیے تھے۔ حیدر آباد اور جونا گڑھ کا سقوط، کشمیر پر بھارت کا غاصبانہ قبضہ اور قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی کشمیر میں اس پر جنگ مسلط کر دینا ایسے معاملات تھے جن کے باعث یہ ملک شدید مشکلات کا شکار تھا اور اس کا مستقبل بھی ایک سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ ایڈیٹر Statesman کی آمد سے چند ماہ قبل وزیر اعظم پاکستان خان لیاقت علی خان کا قتل تو اونٹ کی کمر پر آخری تنکا تھا لیکن یہ نوازئیدہ ریاست ان تمام چیلنجز کا مردانہ وار مقابلہ کرنے میں مصروف تھی۔

ہر چند پاکستان بے شمار مشکلات میں گرفتار تھا اور ان حالات میں کسی غیر ملکی صحافی یا سیاح کی خاطر مدارت کا کسے ہوش تھا لیکن اس کے باوجود سرکاری سطح پر بھی سٹیفن کو بھرپور پذیرائی ملی۔ Statesman کلکتہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے وہ جن مشکل حالات میں پاکستان کے لیے کلمہ خیر کہتا رہا، پاکستان میں اس کا بھرپور احساس موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے آرام و آسائش اور سفر و حضر کا بھرپور خیال رکھا گیا جو کہ پاکستانیوں کی مہمان نوازی کا ایک عمدہ نمونہ تھا۔ غلام محمد گورنر جنرل پاکستان کے ساتھ ۱۹۳۰ء کے عشرے سے اس کی شناسائی تھی جب وہ ایک سرکاری ملازم تھے، پاکستان بننے کے بعد وہ وزیر خزانہ بھی رہے اور اب وہ گورنر جنرل کی حیثیت سے ملک کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز تھے۔ گورنر جنرل کے ساتھ مختلف موضوعات پر اس نے تفصیلی تبادلہ خیالات کیا۔ اس موقع پر اسے ٹھیک چار سال قبل بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح سے اپنی ملاقات یاد آجاتی ہے اس وقت کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آزادی کی جنگ جیتنے والا شخص زندگی

کی بازی ہار چکا ہے اور چند روز کا مہمان ہے۔

ایک غیر جانبدار برطانوی صحافی کی حیثیت سے وہ کشمیر پر پاکستانی موقف کا حامی اور بھارتی نکتہ نظر کا شدید ناقد ہے۔ اس کے خیال میں بھارت نے کشمیر پر فوج اتار کر اپنے سیکولرزم، جمہوریت اور اصول پسندی کے دعوؤں کی قلعی کھول دی ہے۔ کشمیر، جونا گڑھ اور حیدر آباد کے معاملہ میں بھارت نے تین مختلف اور باہم متضاد موقف اپنائے۔ کشمیر کی غالب مسلم اکثریت اور پاکستان کے ساتھ اس کے جغرافیائی اتصال کے باوجود اس نے مہاراجہ کے الحاق کو جواز بنا کر اس پر قبضہ کر لیا۔ جونا گڑھ کے معاملہ میں اس نے بالکل متضاد موقف اختیار کیا جہاں کے راجہ نے پاکستان سے الحاق کا اعلان کیا تھا وہاں باشندوں کی ہندو اکثریت کو جواز بنا کر اس نے جونا گڑھ پر قبضہ کیا۔ حیدر آباد کا راجا بھی مسلمان تھا جبکہ آبادی کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ مہاراجا ریاست کو خود مختار رکھنا چاہتا تھا لیکن آبادی کو بنیاد بناتے ہوئے اس نے حیدر آباد پر بھی قبضہ کر لیا۔ اگر کشمیر کے بارے میں بھارت کا موقف مان لیا جائے تو اسی اصول کی بنیاد پر حیدر آباد اور جونا گڑھ پاکستان کا حصہ بننے چاہیئے تھے اور اگر حیدر آباد اور جونا گڑھ کے بارہ میں بھارت کا موقف درست تسلیم کیا جائے تو کشمیر پاکستان کا حصہ تھا لیکن بھارت نے متضاد موقف اختیار کر کے اصولوں کو پاؤں تلے روند ڈالا۔

۱۱؍مارچ ۱۹۵۲ء سٹیفن رائل پاکستان ائیر فورس کے فرائٹر طیارے کے ذریعے اپنی زندگی کے مشکل ترین فضائی سفر پر روانہ ہوا۔ یہ گلگت کا سفر تھا جسے اس دور میں دنیا کے خطرناک ترین فضائی راستوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ گلگت کی آزادی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ریاست جموں و کشمیر کا یہ دور دراز علاقہ وہاں کے مقامی مجاہدین نے ڈوگرہ فوج سے لڑ کر آزاد کرایا تھا۔ گلگت میں تعینات ڈوگرہ فوج کے مقامی مسلمان سپاہیوں نے بغاوت

کر دی تھی اور کمانڈر گھنسارہ سنگھ کو گرفتار کر کے علاقہ کی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ اس وقت گلگت تک رسائی صرف بذریعہ ہیلی کاپٹر ہی ممکن تھی۔ بلند و بالا برفانی چوٹیوں سے اٹا ہوا اور برف سے ڈھکا ہوا یہ علاقہ عجیب دیو مالائی سرزمین ہے جو ہمیشہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ جہاز نے جب راولپنڈی سے پرواز کی تو راولپنڈی اور ہزارہ کے شہر، قصبے، گاؤں، کھیت، جنگل پہاڑ اپنے نیچے بکھرے ہوئے اسے بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ ابھی درختوں کی کونپلیں نہیں پھوٹی تھیں ______ ابھی مرغزاروں نے زمرد کا لباس نہیں پہنا تھا۔ اس کے باوجود کونپلوں اور پتوں سے محروم ٹنڈ منڈ درخت اس کی توجہ اپنی جانب کھینچتے تھے۔

۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۹ء کی جنگ کشمیر کے عرصہ میں جب وہ Statesman کلکتہ کا ایڈیٹر تھا، بھارتی فوج کے ایک سِکھ جنرل نے اسے سرکاری طور پر کشمیر کے محاذِ جنگ کا دورہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ مسٹر سٹیفن دوسری جنگِ عظیم کے دوران جنگی رپورٹر رہ چکا تھا اور محاذِ جنگ کی خبریں میڈیا کے ذریعے دنیا تک پہنچانا اس کا خاص میدان رہ چکا تھا، اس نے بھارتی فوج کی طرف سے دورہِ کشمیر کی دعوت ٹھکرا دی تھی ۔ کیوں کہ وہ ایک تو کشمیر پر بھارت کے دعوے کو اصولوں کے منافی اور اس کے قبضہ کو غاصبانہ سمجھتا تھا اور دوسرے وہ ایک برطانوی اخبار کے ایڈیٹر اور برطانوی صحافی کی حیثیت سے سرکاری طور پر اس متنازعہ علاقہ کا دورہ کر کے اپنے غیر جانبدارانہ کردار کو مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب جب کہ اس نے Statesman کی ادارت سے استعفیٰ دے دیا تھا، اس متنازعہ خطے کا دورہ کرنے میں اب اسے کوئی ہچکچاہٹ نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد فرائٹر طیارہ نانگا پربت کے پاس سے گزرا۔ مصنف نے اسے دنیا کا خوبصورت ترین پہار ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک ترین پہاڑ بھی قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ اسے قاتل پہاڑ (Killer Mountain) بھی کہا جاتا ہے۔

سٹیفن کے نزدیک اس پہاڑ کے حسن کا سبب بھی وہی ہے جو اس کی خونخوار خصوصیات کا بھی سبب ہے اور وہ ہے اس کی تنہائی ____ اس پہاڑ کے قرب وجوار میں کوئی دوسرا اس طرح کا بلند و بالا پہاڑ موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے اس کا حسن بھی نکھرتا ہے لیکن خوفناک برفانی ہواؤں کا راستہ روکنے والا کوئی دوسرا اس کا ہم جنس موجود نہیں جس کی وجہ سے طوفانِ بادوباراں کی اس پر یلغار رہتی ہے اور اسے سر کرنے والے مہم جوان برفانی طوفانوں کے سامنے زندگی کی بازی ہار بیٹھتے ہیں ____ الزام اس پہاڑ کو دیا جاتا ہے ____ اسے قاتل پہاڑ (Killer Mountain) کا نام دیا جاتا ہے۔

اس حسین وجمیل قاتل پہاڑ کو میں نے بھی بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں کوہ پیما نہیں اور نہ سٹیفن کوہ پیما تھا لہذا ہم دونوں تن بیتی نہیں بلکہ آنکھوں دیکھی ہی بیان کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک اس پہاڑ میں تمام محبوبانہ خصوصیات یکجا ہوگئی ہیں۔ شاعروں نے اپنے معشوقوں کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ سب اس پر صادق آتی ہیں۔ اس کی بلند و بالا قد و قامت ____ اس کا سڈول بدن ____ اس کی گوری چٹی رنگت ____ اس کی چوٹی پر زلفوں کی طرح لہراتے کالے بادل ____ اس کے بدلتے رنگ کہ ابھی اس کی چوٹی پر دھوپ چمکی گویا نانگا پربت مسکرا اُٹھا لیکن تھوڑی ہی دیر میں کالے بادلوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بادل گرجے ____ بجلی چمکی ____ یہ اس کا غصّے سے بھرپور روپ ہے ____ اور سب سے بڑھ کر اپنے چاہنے والوں کو پیار سے مار ڈالنے کی معشوقانہ خو ____ یہ قاتل حسینہ اپنے عشاق کی جان لیتی ہے کہ کسی شاعر نے ایسی ہی حسینہ کی قاتل اداؤں کا نقشہ یوں کھینچا تھا۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

نانگا پربت کے حسن کے اسیر ____ اس کے جنوں میں گرفتار کوہ پیما زندگی کی بازی ہارتے ہیں تو برف کے طوفان میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتے ہیں ____ ان کا نام ونشاں تک نہیں ملتا۔

المیے کی بنیاد

کتاب کے دسویں باب میں مصنف نے کشمیر کے حوالہ سے اپنے مشاہدات و تاثرات بیان کئے ہیں۔ برصغیر کے آخری برطانوی وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ اس کا یارانہ اس وقت سے تھا جب دوسری جنگِ عظیم کے دوران وہ نوتشکیل شدہ ساؤتھ ایسٹ ایشین کمانڈ کے سربراہ بن کر آئے تھے۔ جنگ کے دوران میں مصنف کی ان سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ یہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن جب ۱۹۴۷ء میں تاج برطانیہ کے نمائندہ کی حیثیت سے وائسرائے ہند بن کر آئے تو ان کی شخصیت مصنف کے لیے اور نہ مصنف ان کے لیے اجنبی نہ تھا۔ مصنف کے نزدیک لارڈ ماؤنٹ بیٹن ایک سحر انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ذات میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو قیادت کا لازمہ ہے، ذہانت، صلاحیت، اچھی شکل وصورت اور اس پر مستزاد پیدائشی لارڈ شپ!

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان سے برطانوی راج ختم ہوا اور برصغیر دو آزاد مملکتوں میں تقسیم ہوگیا تو اس کے ساتھ ہی وائسرائے کا منصب بھی ختم ہوگیا۔ اب لارڈ ماؤنٹ بیٹن صرف ایک مملکت (بھارت) کے پہلے گورنر جنرل بن گئے۔ مصنف کو ان کی شخصیت سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن مصنف کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے یہ اطلاع ملی کہ ایک مسلم دشمن مدراسی برہمن گوپالا سوامی آہنگر جو ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۳ء تک ریاست جموں وکشمیر کا وزیر اعظم رہ چکا ہے، کوئی بھارتی کابینہ میں وزیر بے محکمہ کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے۔ یہ اس سازش کی ابتداء تھی جس نے آگے چل کر ریاست جموں وکشمیر پر بھارتی فوج کشی کا

راستہ ہموار کیا۔ اسی طرح تقسیم ہند سے فوراً پہلے اور فوراً بعد کانگریس کے صدر مسٹر اچاریہ کرپلانی کی جانب سے مشرقی پنجاب کی ہندو ریاستوں کے بعض حکمرانوں کے ہمراہ ریاست جموں و کشمیر کے مسلسل دورے اور سب سے بڑھ کر گاندھی جی کی کشمیر میں غیر معمولی دلچسپی سے ہی ہندوستان کے کشمیر کے بارے میں عزائم واضح طور پر سمجھے جاسکتے تھے۔

تقسیم ہند کے ساتھ ہی پورے برصغیر میں ہندو مسلم فسادات کی جو آگ بھڑک اٹھی اس نے سارے خطے کو آگ اور خون کے سمندر میں دھکیل دیا۔ ہندو پریس تو اپنے نکتہ نظر سے ان فسادات کی تشہیر میں مصروف تھا۔ وہ مسلمانوں کو قتل عام کا ذمہ دار اور ہندوؤں کو بے گناہ ثابت کرتا تھا۔ اس یک طرفہ رپورٹنگ سے ہندو آبادی میں مزید اشتعال پیدا ہوتا اور وہ مسلمانوں کی جان و مال اور املاک پر زیادہ جوش و خروش سے حملہ آور ہوتے تھے۔

سٹیفن کے اخبار The Statesman فسادات کی خبروں کی اشاعت سے حتی الامکان گریز کی پالیسی پر گامزن تھا کیوں کہ اس کے خیال میں فسادات کی خبریں فسادات کی آگ مزید بھڑکانے کا ذریعہ بن رہی تھیں۔

مہاراجا ہری سنگھ کے خلاف پونچھ کے عوام کی بغاوت کی خبریں ستمبر میں کلکتہ پہنچنا شروع ہوگئی تھیں۔ ایسی خبریں چونکہ فسادات کے پس منظر میں سارے برعظیم سے آرہی تھیں لہذا پونچھ کی عوامی بغاوت کلکتہ کے پریس میں کوئی نمایاں جگہ نہ پاسکی۔ اکتوبر میں جموں سے مسلمانوں کے قتلِ عام کی خبریں تواتر سے آنا شروع ہوگئیں اور یہ اطلاعات بھی سارے برصغیر میں گشت کرتے کرتے مصنف تک بھی پہنچیں کہ مہاراجا ہری سنگھ کی حکومت کے عہدیدار ہندوؤں اور سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف مسلح کر کے جموں سے مسلمانوں کی نسل کشی کی پالیسی پر گامزن ہیں۔ پونچھ میں مہاراجا کے خلاف عوامی بغاوت اور جموں میں مسلمانوں کے قتلِ عام کی خبریں زیادہ عرصہ نہ دبائی جاسکیں اور اکتوبر ۱۹۴۷ء میں یہ خبریں تواتر

کے ساتھ عالمی پریس میں آنے لگیں تو کلکتہ کے اخبارات نے بھی انہیں نمایاں کرنا شروع کر دیا۔
مسٹر سٹیفن حالات کا قریب سے مشاہدہ کرنے کلکتہ سے دہلی آ گیا۔ یاد رہے کہ اس کا اخبار The Statesman کلکتہ کے علاوہ دہلی سے بھی چھپتا تھا۔ دیگر امور کے علاوہ اپنے دہلی آفس کی کارکردگی کا جائزہ لینا اور دہلی سے تازہ ترین خبروں کے حصول کو یقینی بنانا بھی اس کے دورہ دہلی کے مقاصد میں شامل تھا۔ اتوار ۲۶ر اکتوبر کو وہ دھلی جی ایچ کیو میں فوج کے چیف آف سٹاف جنرل سر رائے بچر (Sir Roy Bucher) سے ملا۔ جنرل بچر بعد میں بھارتی فوج کے کمانڈر انچیف بھی رہے ہیں۔ جب مسٹر سٹیفن جی ایچ کیو پہنچا، جی ایچ کیو اور دہلی کے سرکاری حلقوں میں کشمیر پر قبائلی حملہ کی خبر نے سراسیمگی پھیلا رکھی تھی اور ہر شخص حواس باختہ نظر آ رہا تھا۔ اسی شام گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کے ہاں مصنف ڈنر پر مدعو تھا۔ مصنف اس رات گورنر جنرل کے بدلے ہوئے لب و لہجے سے خاصا مایوس ہوا۔ اس کے نزدیک لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس وقت مکمل ہندو نواز لیڈر معلوم ہو رہے تھے اور گورنر جنرل ہاؤس پر مکمل جنگی کیفیت طاری تھی۔ لارڈ ماونٹ بیٹن نے مسٹر سٹیفن کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ کشمیر میں قبائلی لشکر قائد اعظم محمد علی جناح نے خود منظّم کر کے بھیجا ہے اور یہ کہ مسٹر جناح اس وقت ایبٹ آباد میں کشمیر کی فتح کی خوشخبری سننے کے لیے بیٹھے ہیں تا کہ جونہی خبر ملے، وہ فاتح کی حیثیت سے کشمیر میں داخل ہوں۔ کتاب کے فٹ نوٹ میں مصنف نے واضح کیا ہے کہ اس معاملہ میں کانگریسی قیادت نے لارڈ مانٹ بیٹن کو جھوٹی افواہوں کے ذریعے گمراہ کیا حالاں کہ مسٹر جناح نے اکتوبر کا آخری عشرہ کراچی میں گزارا تھا اور وہ اس دوران ایبٹ آباد گئے ہی نہیں تھے۔ اس مفروضہ کو بنیاد بنا کر اسی شام یعنی ۲۶ر اکتوبر کو ہی دہلی سے ڈکوٹا ہیلی کاپٹروں کے ذریعے فوجی دستے کشمیر بھیجنے کے عمل کا آغاز ہو گیا۔ یوں بھارتی فوج ایک فضائی آپریشن کے ذریعے کشمیر میں داخل ہوئی سٹیفن کے نزدیک

بھارت کا یہ اقدام ریاستوں کے بارہ میں اس کی پالیسی اور اخلاقی اصولوں سے متصادم تھا۔

کھانے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن اسے الگ لے گئے اور صورت حال کے حوالہ سے تنہائی میں بریفنگ دی۔ ابھی تک مہاراجا کی جانب سے الحاق کا معاملہ تکمیلی مراحل میں تھا ماؤنٹ بیٹن کے نزدیک سرینگر کو قبائلی حملے سے بچانے کا واحد راستہ یہی تھا کہ بھارتی فوج کشمیر کا کنٹرول سنبھال لے۔ ان کا اظہار تھا کہ اس مرحلہ پر کشمیر کا بھارت سے الحاق کشمیر میں آزادانہ رائے شماری سے مشروط ہوگا۔ مصنف کو خدشہ ہے کہ ایک مرتبہ الحاق ہو جانے کے بعد رائے شماری عملی طور پر ممکن نہ ہوگی اور اس سے ایک بڑے المیے کا آغاز ہو جائے گا۔ اس کے بعد اس نے بھارت کے نائب وزیر اعظم سردار پٹیل سے ملاقات کا اہتمام کیا۔ اس کے خیالات سے عدم اتفاق کے باوجود وہ مضبوط اعصاب کے مالک اس بوڑھے سیاستدان سے بہت متاثر ہوا۔ وہ اس کے گزرنے والے پانچ منٹوں نہرو کے ساتھ گزارے ہوئے پندرہ منٹوں پر بھاری قرار دیتا ہے۔

اس مرحلہ پر مصنف کشمیر میں قبائلی لشکر کشی کو ایک سنگین غلطی قرار دیتا ہے، قبائلیوں کے ہاتھوں وادیِ کشمیر میں ہونے والی لوٹ مار کو بنیاد بنا کر بھارت کو کشمیر میں اپنی افواج داخل کرنے کا جواز ملا۔ اسی طرح وہ جونا گڑھ کے نواب کی طرف سے پاکستان کے ساتھ الحاق کو حکومت پاکستان کی جانب سے قبول کئے جانے کے عمل کو بھی سنگین غلطی قرار دیتا ہے۔

آزاد کشمیر میں

۲۲ر مارچ ۱۹۵۲ء کو سٹیفن کار کے ذریعے راولپنڈی سے میر پور کے لیے روانہ ہوا۔ یہ سفر اس نے آرمی میڈیکل کور کے کرنل عبداللہ نامی شخص کی معیت میں کیا جس کی شکل وصورت اس نے لینن سے مشابہ بیان کی ہے۔ راولپنڈی سے وہ دونوں جہلم پہنچے۔ قبل ازیں سٹیفن ۱۱ر مارچ کو دریائے جہلم کے کنارے واقع اس شہر کا فضائی جائزہ لے چکا

تھا۔ تب وہ جنگی نکتہ نظر سے مشہور سرحدی قصبے علی بیگ کا نظارہ کرنے گیا تھا۔ علی بیگ ان دنوں بھارتی نکتہ نظر سے ایک خوفناک مقام تصور کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں پونچھ سے ترک سکونت کرنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو اس مقام پر محبوس رکھا گیا تھا۔ اس حوالہ سے متعدد کہانیاں مشہور ہیں تاہم مصنف کا کہنا ہے کہ ایسی کہانیاں دونوں طرف اپنے اپنے نکتہ نظر سے مشہور کی گئی ہیں جن کی حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جہلم سے مصنف منگلا روانہ ہوا۔ یہاں اس نے شہنشاہ اکبر کے دور کے قلعہ منگلا کی سیر بھی کی۔ شاید اسے کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ڈوگرہ خاندان کے بانی مہاراجا گلاب سنگھ نے اپنے کیرئر کا آغاز اسی منگلا قلعہ میں ایک اردلی کی حیثیت سے کیا تھا اور بعد میں اس نے اپنی عیاری اور مکاری سے کام لیتے ہوئے پوری ریاست جموں و کشمیر کو انگریزوں سے خرید کر اپنے قبضہ میں لے لیا۔

منگلا سے مصنف کرنل عبداللہ کے ہمراہ میر پور شہر پہنچا جہاں اس نے جنگِ آزادی کے زخمیوں کے لیے قائم ہسپتال کا دورہ کرنا تھا۔ اس نے جنگ بندی کے تین سال بعد اس علاقے کا دورہ کیا تھا جب بھارتی فوج کی گولہ باری کے نتیجہ میں ہونے والی تباہی کے آثار کسی حد تک کم ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود اس نے بدقسمت شہر میر پور کو کھنڈرات کی شکل میں دیکھا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کے شہروں میں سب سے زیادہ تباہی و بربادی میر پور کا مقدر بنی ہے۔ مصنف کے بیان کے مطابق ۱۹۴۷ء میں اس قصبے کی آبادی پندرہ ہزار تھی جب کہ اب (۱۹۵۲میں) صرف تین ہزار کی آبادی باقی رہ گئی ہے۔ اس وقت شہر ویران ہے۔ دکانیں بند پڑی ہیں۔ اکادکا دکانیں کھلی بھی ہیں تو سرِ شام ہی دکاندار انہیں بند کر کے اپنی جان بچانے اردگرد کے دیہات میں چلے جاتے ہیں۔ مکانات ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں، بعض کی دیواریں گری ہیں تو بعض کی چھتیں ہی اُڑ گئی ہیں۔ لوگوں کو سر چھپانے کے لئے

جائے پناہ بھی میسر نہیں۔ یہ علاقہ اس ہولناک جنگ کی تباہ کاریوں کا بری طرح نشانہ بنا ہے۔

دوسرے دن سہ پہر کو مسٹر سٹیفن کرنل عبداللہ کی جیپ میں کوٹلی کے لیے روانہ ہوا۔ چیل کے درختوں میں گھرے ہوئے پہاڑوں میں کسی مخمور سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک کبھی لہرا کر پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتی اور دفعتاً ایک شانِ بے نیازی سے بل کھا کر دوسری طرف گہرائی میں اتر جاتی۔ راستے میں سڑک کے کنارے نیشنل گارڈز کا ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ گہری سبز وردی میں ملبوس نیشنل گارڈز اپنے مقصد سے لگن اور نظم وضبط کی عمدہ مثال پیش کر رہے تھے۔ کوٹلی کو میرپور سے ملانے والی پرانی سڑک چھ میل تک سیز فائر لائن کے پار رہ گئی تھی لہذا اس فاصلے کو پاٹنے کے لیے ایک نئی سڑک تعمیر کی گئی تھی۔ اس علاقے میں بقول سٹیفن کے، چیتوں کے حملے کا خطرہ رہتا ہے کیوں کہ چیتا ایسے ہی جنگلوں میں اپنا ٹھکانہ بناتا ہے۔ اس کے ذہن میں اس خطرے نے سر اٹھایا ہی تھا کہ جیپ کے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی اور وہ ایک گڑگڑاہٹ سے بند ہوگیا۔ ڈرائیور نے خرابی دور کرنے کی اپنی سی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ یہ شام سٹیفن کو اپنی زندگی کی شام محسوس ہورہی تھی۔ وہ اس خوف میں مبتلا تھا کہ ابھی کوئی چیتا ادھر جھاڑیوں سے برامد ہوگا اور اسے اپنا نوالہ بنا لے گا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک فوجی ٹرک کہیں سے آگیا۔ ٹرک میں جگہ نہ تھی تاہم کرنل عبداللہ اور سٹیفن اس پر سوار ہوکر کوٹلی پہنچ گئے۔ کوٹلی میں انہوں نے بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں قیام کیا۔ دوسرے دن مسٹر سٹیفن ایک جیپ میں سوار ہوکر کھوئی رٹہ کے علاقہ ٹائیں میں سیز فائر لائین پر قائم شدہ No Mans land دیکھنے چلا گیا۔ اس موقع پر کیپٹن سکندر نامی ایک فوجی آفیسر اس کا ہمسفر تھا جس نے علاقہ کا اس سے تعارف کرایا۔ کیپٹن سکندر کا تعلق جموں سے تھا۔ ۱۹۴۷ء میں وہ ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے جیل میں تھا جب جموں میں فسادات کی آگ بھڑکی، اس کا سارا خاندان تہ تیغ ہوگیا۔ جیل میں ہونے کے باعث سکندر زندہ بچنے

میں کامیاب ہو گیا تھا جو بعد میں رہا ہو کر آزاد کشمیر پہنچ گیا تھا۔ اس وقت وہ آزاد کشمیر کی فوج میں کیپٹن کی حیثیت سے خدمات سر انجام دے رہا تھا۔ اس وقت کھوئی رٹہ کا پورا علاقہ کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کوئی گھر سلامت نہ تھا۔ اگرچہ فوج کے زیر نگرانی تعمیر نو کا عمل جاری تھا تاہم تباہی اس قدر شدید تھی کہ ابھی تک متاثرین کی آبادکاری اور بحالی میں بڑا عرصہ درکار تھا۔

۲۵ رمارچ کو مسٹر سٹیفن اور کرنل عبداللہ کوٹلی سے چل کر ہجیرہ پہنچے۔ ہجیرہ کی وادی کے ایک کونے پر کرنل نے اسے گارے اور لکڑی کے بنے ہوئے جھونپڑوں کی ایک قطار دکھائی۔ یہ بھی ایک ہسپتال تھا جو کنٹرول لائین کے متاثرین کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ مقامی آبادی زخمیوں اور مریضوں کے لیے تازہ دودھ، مکھن، انڈے اور مرغ رضا کارانہ طور پر مہیا کرتی تھی۔ کنٹرول لائین سے قریب ان علاقوں میں آمد و رفت رات کے وقت ہی ہو سکتی تھی کیونکہ دن کے وقت بھارتی طیارے پرواز کرتے ہوئے اکثر آزاد علاقے میں گھس آتے تھے اور بمباری کرتے تھے۔ بھارتی چیک پوسٹوں سے ہونے والی بلا اشتعال فائرنگ اس کے علاوہ تھی۔ علاقے کے اکثر پُل ٹوٹ چکے تھے اور فوج نے ہنگامی بنیادوں پر نئے پُل نصب کیئے تھے۔ پرانے شکستہ پُل بھی نئے پلوں کے پہلو بہ پہلو دیکھ جا سکتے تھے۔

ہجیرہ میں ہی مسٹر سٹیفن کی ملاقات سویڈن سے تعلق رکھنے والے ایک فوجی آفیسر سے ہوئی جو اقوام متحدہ کے مبصر کی حیثیت سے اس علاقہ میں تعینات تھا۔ وہ ابھی ابھی لائین آف کنٹرول پر بھارتی فائرنگ کے ایک واقعہ کا مشاہدہ کر کے آیا تھا۔ اس واقعہ میں دو باپ بیٹا بھارتی فوج کی گولہ باری کا نشانہ بن کر شہید ہوئے تھے۔ اقوام متحدہ کا مبصر اس واقعہ کی رپورٹ اپنے ہیڈ کوارٹر کو بھیجنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ہجیرہ سے چل کر رات انہوں نے تراڑکھل میں قیام کیا۔ یہاں سے کرنل عبداللہ راولپنڈی چلا گیا جب کہ مسٹر سٹیفن تراڑکھل

سے پیدل پلندری کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک مقام پر برطانوی فوج سے ریٹائر ہونے والے ایک بڑے دستے نے اس کا استقبال کیا۔ اس علاقے کے مقامی باشندے تھے جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں اتحادی فوجوں کے شانہ بشانہ مختلف محاذوں پر سینہ سپر رہے، ان میں سے بے شمار لوگوں کو بہادری کے تمغے ملے تھے۔ یہ تمام سابق فوجی، برطانوی فوج کی وردی میں ملبوس تھے اور جنگِ عظیم دوئم کے فوجی تمغے اپنے سینوں اور شانوں پر سجائے ہوئے تھے۔ مصنف کے الفاظ میں یہ لوگ ماہر جنگجو ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مہاراجا ہری سنگھ کی فوج ان کے مقابل نہ ٹک سکی۔ اسی جگہ مقامی باشندوں نے اسکے اعزاز میں پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ یہاں سے روانہ ہو کر اس نے رات پلندری میں ڈسٹرکٹ مجسٹریت کے ہاں گزاری، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس کے آرام و آسائش کا بھرپور خیال رکھا۔ رات پلندری میں بسر کر کے دوسرے دن وہ بھی راولپنڈی روانہ ہو گیا۔

چند روز بعد وہ راولپنڈی سے آزاد جموں و کشمیر حکومت کے دارالحکومت مظفر آباد کے لیے روانہ ہوا۔ اس کی گاڑی مری کی بلندی کی طرف رواں دواں تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مری ۱۹۴۷ء کے فسادات میں راکھ کا ڈھیر بن گیا ہو گا کیونکہ ہندوستان میں اسے مسلسل یہی اطلاعات مل رہی تھیں کہ مسلمانوں نے مری میں ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کی املاک کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے اور اب مری کا قصبہ صفحہ ہستی پر موجود ہی نہیں لیکن اسے ۷۰۰۰ فٹ کی بلندی پر آباد مری ہل سٹیشن کو موجود پا کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ کہتا ہے کہ ہندو پریس میں اس حوالے سے شائع ہونے والی رپورٹیں مبالغہ آمیز تھیں تاہم متعدد عمارات ان فسادات کی نذر ضرور ہوئی تھیں۔ برطانوی ہند میں دارجلنگ، میسوری، شملہ اور مری ایسے ہل سٹیشن تھے جنہیں انگریز ہندوستان میں اپنا گھر سمجھتے تھے۔ ہندوستان کے میدانوں سے گرمی کے ستائے ہوئے ہزاروں انگریز ان سرد مقامات کا رُخ کرتے تھے اور گرمیوں کا عرصہ ایسے سرد

مقامات پر گزارتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد ایسے سرمائی مقامات میں سے صرف مری پاکستان کے حصے میں آیا تھا۔ کوئی برطانوی پاکستان آئے اور مری نہ دیکھے، یہ ممکن نہ تھا۔ مسٹر سٹیفن کو قبل ازیں مری دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا لہذا وہ اس کے لیے بیتاب بھی تھا۔ آج وہی ملکہ کوھسار، مری اس کے روبرو تھی۔ مری کے حُسن نے اس کا دامنِ دل موہ لیا۔ وہ یہاں کے حسنِ فطرت کا اسیر ہو سکتا تھا لیکن آج اسے اپنے اگلے پڑاؤ، مظفر آباد پہنچنا تھا لہذا وہ مری کی چوٹیوں کو الوداعی سلام کہہ کر کوہالہ کی اترائی اترنے لگا۔ بل کھاتی سڑک پر گاڑی درمیانی رفتار سے رواں دواں تھی۔ اب اس کی گاڑی دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ اس کے بہاؤ کی مخلف سمت میں رواں دواں تھی۔

وہ کوہالہ پُل عبور کر کے آزاد کشمیر کی حدود میں داخل ہوا۔ پل کا پاکستانی سرا تو محفوظ تھا لیکن آزاد کشمیر کی جانب دوسرا سرا اور اس سے ملحقہ بازار بھارتی گولہ باری سے بُری طرح متاثر تھا۔ یہاں سے دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے وہ دومیل پہنچا۔ دومیل میں بھی اسے ہر جگہ گولہ باری کے نشانات دیکھنے کو ملے۔ اس نے قصبہ مظفر آباد کا تفصیلی جائزہ لیا یہاں بھی تباہی اور بربادی کے نشانات دیکھے جا سکتے تھے لیکن یہ تباہی صرف بھارتی طیاروں کی بمباری سے ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ بعض عمارتیں قبائلی حملہ آوروں نے بھی جلا ڈالی تھیں۔

مظفر آباد کے بارہ میں مسٹر سٹیفن کا بیان ہے کہ یہ ایک خوبصورت محل وقوع کا حامل قصبہ ہے۔ دو دریاؤں کے سنگم پر واقع یہ قصبہ اپنے مستقبل کے بارے میں بے یقینی کا شکار ہے۔ پہاڑوں کے آہنی پردوں کے پیچھے بھارتی فوج حملہ کے لیے تیار کھڑی ہے۔ یہ آزاد جموں و کشمیر کی عبوری حکومت کا عارضی دارالحکومت ہے۔ اس شدید بے یقینی اور عدم

تحفظ کے احساس کے باوجود لوگ خوش وخرم اور ہشاش بشاش نظر آتے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس کے پہلو میں ایک بزرگ صوفی کا مزار ہے جہاں عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔

اس نے اپنے قیام مظفر آباد کے دوران حکومت کے عمائدین سے بھی ملاقاتیں کیں اور سرکاری دفاتر کی کارکردگی کا بھی جائزہ لیا۔ اس کا خیال ہے کہ یہ عارضی حکومت اپنے معیار کارکردگی کے اعتبار سے سری نگر میں شیخ عبداللہ کی حکومت سے کسی طرح کم نہیں تاہم عمائدین حکومت باہم رسہ کشی اور بداعتمادی کا شکار ہیں۔ حکومت آزاد کشمیر کے دو بڑے لیڈروں سردار محمد ابراھیم خان اور چوہدری غلام عباس کے درمیان کھینچا تانی جاری ہے جس کے اثرات آزاد حکومت کے محکموں اور دفاتر پر بھی پڑ رہے ہیں۔ مسٹر سٹیفن کی آمد کے موقع پر یہ دونوں حضرات دارالحکومت میں موجود نہ تھے جس کے باعث اس کی ان سے ملاقات نہ ہوسکی تاہم ایک تیسرے رہنما میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ سے اس کی تفصیلی ملاقات ہوئی۔ چوہدری غلام عباس جموں کے مسلمانوں کے نمائندہ ہیں جن کی بڑی تعداد ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئی۔ بڑی تعداد میں مسلمان وہاں گاجر مولی کی طرح کاٹ دیئے گئے۔ جموں میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد دو لاکھ سے زائد ہے۔ اس لحاظ سے چوہدری غلام عباس ان قربانیوں کی بدولت عوام الناس کی نظروں میں قابلِ احترام ہیں۔ دوسری طرف سردار محمد ابراہیم خان سدھن قبیلے کے سربراہ ہیں۔ اس قبیلے کا موجودہ آزاد کشمیر کی آزادی میں قلیدی کردار ہے۔ عسکری پس منظر کا حامل یہ قبیلہ پونچھ کا اکثریتی قبیلہ ہے اور تحریک آزادی میں اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی رہی ہے۔ سردار محمد ابراہیم خان جوشیلے، پُرعزم، بہادر اور ہردلعزیز نوجوان راہنما ہیں۔ ان دونوں قائدین کی کشمکش اس سسٹم کی کمزوری کا باعث بن رہی ہے۔

مصنف کے خیال میں چوہدری غلام عباس کے جانشین میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ

ہیں۔ میر واعظ سے مصنف کی ملاقات بڑی خوشگوار رہی ہے۔ میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ آزاد کشمیر ہجرت سے قبل سرینگر کی جامع مسجد کے امام اور ریاست کے ہر دلعزیز مسلمان راہنما رہے ہیں ۔ خوبصورت، بھوری داڑھی سے مزین چہرے والے منکسر المزاج میر واعظ انگریزی سے آشنا نہ ہونے کی وجہ سے حکومتی معاملات میں دشواری محسوس کر رہے ہیں۔

مظفر آباد کا دورہ مکمل کرنے کے بعد مسٹر سٹیفن واپس راولپنڈی چلا گیا جہاں سے اس نے سری نگر روانگی کے لیے قسمت آزمائی کرنا تھی۔ بھارت اور اقوامِ متحدہ کی طرف سے سری نگر کے دورہ کی اجازت ملنے یا نہ ملنے کا فیصلہ ہونے میں ابھی کافی مراحل باقی تھے۔ پاکستان، بھارت اور اقوام متحدہ کی طرف سے اس سلسلہ میں خطوط، گفت وشنید اور دستاویزات کا تبادلہ جاری تھا۔ تفصیلات اور شرائط طے کی جارہی تھیں ______ اندیشے اور خدشات زیر بحث لائے جارہے تھے۔ اس دورے کے پس پردہ محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مصنف نے گلگت بلتستان کا ایک سفر کرنے کی ٹھان لی اس مرتبہ وہ وادی ہنزہ اور سکردو کا دورہ کرنے کا متمنی تھا۔

۳/اپریل ۱۹۵۲ء کو وہ ایک مرتبہ پھر گلگت کے فضائی سفر پر روانہ ہوا۔ اس مرتبہ موسم خوشگوار تھا۔ کسی قسم کی دشواری راہ میں حائل نہ تھی۔ اس مرتبہ وہ پاکستان ائیر فورس کے فرائٹر طیارے کی بجائے سویلین ''ڈکوٹا'' میں محو پرواز تھا، جو اس سفر کے لیے فرائٹر کی نسبت بہتر طیارہ تھا۔ اس کا کپتان Maksymowiczs نامی ایک یورپی نوجوان تھا جس کی خدمات حکومت پاکستان نے حاصل کر رکھی تھیں۔ طیارہ رن وے سے ٹیک آف کر چکا تھا۔ راولپنڈی اور قرب وجوار کی آبادیاں کسی ماہر مصور کی بنائی ہوئی پینٹنگ کی طرح نظر آرہی تھیں۔ دائیں جانب اسے مری کی جنگلات سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں نظر آنے لگیں جو تھوڑی

دیر میں نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ پھر ایبٹ آباد کا علاقہ شروع ہوا۔ یہاں سے گزرتے ہوئے اس نے کافی فاصلے پر مظفرآباد شہر کا بھی نظارہ کیا۔ بقول اس کے اسے دومیل پل، سیکرٹریٹ کی سفید عمارت اور ریسٹ ہاؤس نظر آرہے تھے۔ اب کاغان وادی اس کے سامنے تھے جسے پاکستانی حکام ایک سیاحتی مقام کی حیثیت سے کشمیر کے متبادل کے طور پر متعارف کراتے تھے۔ بالکل سامنے، گلگت سے بھی پرے اسے کچھ اور چوٹیاں بھی دکھائی دینے لگیں۔ ان میں سے ایک راکاپوشی تھی جس پر قبل ازیں اس کی نگاہ نہیں پڑ سکی تھی۔ راکاپوشی ہنزہ کے راستے میں دائیں سمت آتی ہے۔ اس سفر میں اس کی منزل ہنزہ تھی لہذا وہ اس کا قریب سے مشاہدہ کرسکتا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اس کا جہاز گلگت کے رن وے پر اتر چکا تھا۔

گلگت میں اس کا پروگرام فرید اللہ شاہ پولیٹیکل ایجنٹ گلگت کے ہاں قیام کا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ شہر میں موجود نہیں تھا۔ اس کا ہیڈ کلرک ہمایوں بیگ موجود تھا۔ اس نے اسے کہیں اور ٹھہرانے کا بندوبست کرلیا اور اس کے آرام و آسائش اور ضروریات کا بھرپور خیال رکھا۔ بعد میں فرید اللہ شاہ پولیٹیکل ایجنٹ کی دورہ سے واپسی پر اس نے اپنے مہمان کی خوب خاطر مدارت کی۔

اس موقع پر مسٹر سٹیفن نے گلگت کی فوجی و نیم فوجی صورت حال اور ان عوامل کا بھی جائزہ لیا ہے جس کے نتیجہ میں یہ خطہ آزادی کی دولت سے مالا مال ہوا۔

اس دور میں اس علاقے میں فرنٹیئر کور تعینات تھی جو کہ مقامی طور پر بھرتی کیے گئے نوجوانوں پر مشتمل ایک مقامی تنظیم تھی البتہ اس کے افسران کا تعلق پاک فوج سے تھا۔ یہ علاقہ بلند و بالا برفپوش چوٹیوں، پہاڑی دروں اور دشوار گزار گھاٹیوں پر مشتمل دنیا کا مشکل ترین علاقہ ہے۔ پاکستان کی یہ سرحدیں دنیا کے مشکل ترین سرحدی علاقوں میں شمار

ہوتی ہیں۔ ایک طرف بھارت اور چین، دوسری طرف افغانستان اور درمیان میں واخان کی تنگ سی پٹی کے پار، چند کلومیٹر کے فاصلے پر روس کی موجودگی کے باعث یہ علاقہ حربی اعتبار سے دنیا کا اہم ترین علاقہ تصور ہوتا ہے۔ اس علاقے کا دفاع فرنٹیئر کور کے ذمہ ہے جو بڑی مستعدی سے اس فرض کو نبھا رہی ہے۔

قیام پاکستان سے قبل برطانوی عہد میں اس علاقے کا کنٹرول گلگت سکاؤٹس کے پاس تھا۔ گلگت سکاؤٹس پولیٹکل ایجنٹ کے ماتحت تھے۔ باقاعدہ فوج نہ ہونے کے باوجود فرنٹیئر کور اس سسٹم کے تحت جوان اور یہ ہمت فوج دشمن سے کسی طرح کم نہیں۔ جن علاقوں میں یہ تعینات ہیں سال کا زیادہ حصہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ باقی دنیا سے اس علاقے کا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں فرنٹیئر کور کے یہ جوان بلند برفانی پہاڑوں پر اپنے مورچوں میں رہتے ہیں۔ ان کا گزارہ اس محدود راشن سے ہوتا ہے جو پیراشوٹ کے ذریعے ان کے مورچوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ مسٹر سٹیفن نے اس علاقے میں تعینات فرنٹیئر کور کی پیشہ وارانہ مہارت، دفاع وطن کے جذبے اور مشکل ترین حالات میں مستعدی سے فرائض کی انجام دہی پر دل کھول کر تعریف کی ہے۔

گلگت کی آزادی

۱۹۳۵ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے گلگت کا انتظام و انصرام ایک معاہدہ کے تحت حکومت برطانیہ کے حوالے کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب برصغیر پاک و ہند سے برطانوی اقتدار کا خاتمہ ہوا اور بھارت اور پاکستان کے نام سے دو آزاد ملک دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئے اس وقت اس علاقے میں گلگت سکاؤٹس تعینات تھے جن کا کنٹرول برطانوی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے پولیٹکل ایجنٹ کے ہاتھ میں تھا۔ برطانوی راج کے خاتمے کے بعد اب وہ پھر مہاراجا ہری سنگھ کی غلامی میں چلے جانے کے خدشے کے باعث گلگت

سکاؤٹس کے جوان اور سول انتظامیہ کے ملازمین میں تشویش پائی جاتی تھی۔ وہ اس صورت حال میں کوئی لائحہ عمل تیار کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ مہاراجا ہری سنگھ نے اپنا ایک قریبی رشتہ دار (بریگیڈئر گھنسارا سنگھ) اس علاقے کا گورنر بنا کر بھیج دیا جس نے آتے ہی پولیٹکل ایجنٹ کے دفتر اور بنگلہ سمیت سارے علاقے کا کنٹرول سنبھال لیا۔ اسی عرصہ میں پونچھ کے علاقے سے مقامی مسلمان مجاہدین نے مہاراجا ہری سنگھ کی حکومت کے خلاف جہاد آزادی کا آغاز کر کے ایک بڑا علاقہ آزاد کرالیا تھا اور آزاد حکومت ریاست جموں وکشمیر کے نام سے ایک حکومت بھی قائم کر لی تھی۔ یہ خبریں جب گلگت پہنچیں تو وہاں کے عوام میں بھی آزادی کی تڑپ شعلہ جوالہ بن گئی۔ اس موقع پر گلگت سکاؤٹس کے جوانوں اور سول انتظامیہ کے ملازمین نے عوامی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے ڈوگرہ راج کے خلاف بغاوت کی منصوبہ بندی کی۔ اس سلسلہ میں گلگت سکاؤٹس میں دو برطانوی آفیسر بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، انھوں نے بھی عوامی امنگوں اور گلگت سکاؤٹس کے جوانوں کے عزم آزادی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح گلگت سکاؤٹس کے جوانوں نے گورنر بریگیڈیر گھنسارا سنگھ کو گرفتار کر کے علاقے کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ بونجی (استور) میں مہاراجا ہری سنگھ کی فوج کا گیریرن ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس کی جانب سے ممکنہ مزاحمت کا تدارک کیا گیا اور پورا علاقہ گلگت سکاؤٹس کی منظم حکمت عملی، پیشہ وارانہ مہارت، جذبہ آزادی اور عوام کے بھرپور تعاون سے آزادی کی منزل سے ہمکنار ہوا۔ جب پورا برصغیر فسادات کی آگ میں جل رہا تھا، گلگت کا یہ اعلانِ آزادی بڑی حد تک ایک پرامن عمل تھا جو کسی بڑے خون خرابے کے بغیر تکمیل پذیر ہوا۔ یہاں تک کہ گرفتار گورنر کو بھی بعد میں قیدیوں کے تبادلہ میں رہا کر دیا گیا جس نے سری نگر پہنچنے پر اس امر کا اعتراف کیا کہ مجاہدین نے دوران گرفتاری اس سے حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا اور اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائی۔

وادی ہنزہ کی سیر

۶/اپریل کو مسٹر سٹیفن ایک جیپ پر وادی ہنزہ کے سفر پر روانہ ہوا۔ جیپ ایک نا ہموار تنگ کچی سڑک پر دریائے ہنزہ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک طرف سبزہ و گیاہ سے محروم سنگلاخ بلند و بالا پہاڑ اور دوسری طرف شور مچاتا، جھاگ اڑاتا دریائے ہنزہ ______ سارا علاقہ بنجر اور ویران لیکن کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی وادیوں میں آبادی اور شادابی کا منظر، ایسے لگتا جیسے ویرانے میں بہار آئی ہو ______ تھی بھی حقیقتاً بہار ہی ______ کہ یہ پھولوں کے کھلنے کا موسم تھا۔ سیب اور ناشپاتی کے پھول ______ خوبانی اور بادام کے پھول ______ گلاب اور چنبیلی کے پھول ______ مختلف رنگوں کے پھول ______ خوشبوئیں بکھیرتے پھول ______ وہ چلتے چلتے نومل نامی گاؤں پہنچا جہاں اس کے خانسامے کے بیٹے کا گھر تھا ______ نومل نسبتاً کشادہ گاؤں ہے جو دریا کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ دریا پر رسوں کا پُل دونوں کناروں پر آباد گاؤں کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔ نومل سے چل کر اس کی اگلی منزل چلت تھی۔ یہاں سے گاڑی واپس نومل بھیج دی گئی اور دو گدھے کرائے پر حاصل کیے گئے ایک گدھے پر اس کا اسباب سفر لادا گیا تھا جبکہ دوسرے پر وہ اور رحیم خان دونوں سوار ہو گئے۔ شام سٹیفن اور اس کا ہم سفر مایوں MAYUN نامی مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں ایک ریسٹ ہاؤس میں انہیں قیام کرنا تھا۔ رات کو جب بادل چھٹ گئے اور نصف شب کا چاند اپنی دودھیا چاندنی بکھیرنے لگا تو اسے اپنے سامنے کا منظر دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آتا تھا۔ V (وی) کی شکل کے پہاڑوں کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی برف پوش چوٹی راکاپوشی

اس کے سامنے تھی۔ قبل ازیں اس نے اس چوٹی کا نظارہ دوران پرواز کرلیا تھا لیکن اتنے قریب سے اسے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ۲۵۵۵۰ فٹ بلند یہ چوٹی دنیا کی اہم ترین پہاڑی چوٹیوں میں شمار کی جاتی ہے ______ اس کی سفید برف سے چاندنی منعکس ہو کر ماحول میں عجیب سحر انگیز تاثر پیدا کر رہی تھی۔ وہ ریسٹ ہاؤس کے برامدے سے رات کا بڑا حصہ اٹھ اٹھ کر اس نظارے سے اپنے قلب ونظر کی تسکین کا سامان کرتا رہا۔

دوسرے دن ایک طویل سفر طے کر کے وہ ریاست ہنزہ کے صدر مقام بلتت اس حال میں پہنچے کہ وہ اور ان کے گدھے تھک کر چور ہو چکے تھے، راستے میں ایک دو مقامات پر بھڑوں نے بھی ان پر حملہ کیا تھا اور وہ بمشکل جان بچانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اب وہ بلتت پہنچ چکے تھے۔ سامنے بلندی پر انڈے کی طرح سفید عمارت اپنی پوری آن بان سے کھڑی تھی۔ یہ میر آف ہنزہ کا محل تھا۔ میر آف ہنزہ سے سٹیفن کی ملاقات کراچی میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کی رہائش گاہ پر دو ماہ قبل ہو چکی تھی۔ ابھی وہ اس کے ریاستی دارالحکومت میں اس سے ملاقات کے امکان پر غور کر ہی رہا تھا کہ سامنے سے سبز کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔ وہ مقامی ڈاکیہ تھا جو فر فر انگریزی بول رہا تھا۔ اس نے والئی ہنزہ کا پیغام اسے پہنچایا کہ ان کے قیام وطعام کا بندوبست ریسٹ ہاؤس میں کیا گیا ہے اور رات آرام کرنے کے بعد دوسرے دن والئی ہنزہ سے ان کی ملاقات طے ہے۔

دوسرے دن والئی ہنزہ سے ملاقات کے بعد مسٹر سٹیفن نے وادی نگر کی سیاحت کا پروگرام بنایا۔ وادی نگر میں کوئی سڑک نہ تھی لہذا اسے یہ سارا سفر گدھے کی پشت پر طے کرنا پڑا۔ یہ سفر بڑا کھٹن اور مشکلات سے پُر تھا۔ خدا خدا کر کے وہ بالاخر قلعہ نگر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ والئی نگر کا محل تھا۔ والئی نگر محل میں موجود نہ تھا تاہم اس کے نائب، اس کے آٹھ سالہ بیٹے نے اس کا ایسا شاندار استقبال کیا کہ وہ حیران رہ گیا۔ مسٹر سٹیفن نے اس

سفر کے دوران ہنزہ اور نگر دونوں ریاستوں کے حالات، ان کے باشندوں کے رسم ورواج، جغرافیائی اور موسمی صورت حال پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کے نزدیک ہنزہ اور نگر دو جڑواں ریاستیں ہیں جن میں بہت کچھ مشترک اور کافی کچھ مختلف بھی ہے۔ دونوں ریاستیں ایک ہی دریا کے کنارے واقع ہیں لیکن دریا بے رحمی سے انہیں ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے ـــــــ دونوں ریاستوں کی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے لیکن دو الگ الگ فرقوں سے وابستہ۔ ہنزہ اسماعیلی آبادی پر مشتمل ہے جبکہ نگر شیعہ اکثریت کی ریاست ہے ـــــ دونوں ایک ہی جغرافیائی خطے میں واقع ہیں لیکن ہنزہ کا رُخ جنوب مشرق کی سمت ہونے کے باعث براہ راست سورج کی روشنی سے مستفید ہوتا ہے جب کہ نگر کا رُخ شمال مغرب کی سمت ہونے کے باعث سال کا بیشتر حصہ دھوپ سے محروم رہتا ہے۔ دونوں ریاستیں کاشغر کے تجارتی راستے پر ہیں لیکن ہنزہ سے سڑک گزرتی ہے جبکہ نگر شاہراہ عام سے ہٹ کر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر تاجر اور سیاح ہنزہ کا رخ کرتے ہیں اور نگر تجارتی اور سیاحتی سرگرمیوں سے محروم رہتا ہے۔ ہنزہ تاریخ میں ہمیشہ ایک توسیع پسند اور توسیع پذیر ریاست رہی ہے جب کہ نگر ہر دور میں بیرونی حملوں کا نشانہ اور اپنے دفاع کی جدوجہد میں مصروف رہی ہے۔ مصنف کے مطابق یہ تو سرزمین کا فرق ہے۔ دونوں ریاستوں کے باشندوں کے انداز واطوار، اخلاق وعادات اور مزاج میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ دونوں ریاستوں کے باشندے کشادہ دل، مہمان نواز اور انسان دوست ہیں۔ اس علاقے میں جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر اور امن وامان کی صورت حال مثالی ہے۔ ہر دو ریاستوں کے عوام کا معیار زندگی باقی برصغیر کی نسبت کافی بلند ہے۔ گداگری نام کو نہیں۔ لوگ جفاکش بہادر اور محنتی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی رنگت عام ایشیائیوں کے برعکس گوری چٹی ہے۔ بعض اتنے گورے ہیں کہ ان پر یورپی ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

سکردو کا فضائی نظارہ

مسٹر سٹیفن ہنزہ اور نگر کی سیاحت مکمل کرنے کے بعد گلگت پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ کراچی میں امریکی قونصل خانے کا نیول اتاشی کپتان بال جیکسن اپنی بیوی کے ہمراہ ایک خصوصی طیارے کے ذریعے گلگت آیا ہوا ہے اور فرید اللہ پولیٹیکل ایجنٹ کے ہاں قیام پذیر ہے۔ سٹیفن بھی فرید اللہ ہی کا مہمان تھا۔ مسٹر اور مسز جیکسن سکردو کے فضائی سفر کے ارادے سے گئے تھے سٹیفن کو ان کا ہمسفر بنتے ہوئے سکردو کی فضائی سیاحت کا موقع مل گیا۔ اس سفر میں اس کے دائیں طرف جانا پہچانا نانگا پربت تھا جبکہ بائیں طرف راکاپوشی۔ ایک طرف استور اور دوسری طرف ہنزہ ویلی ________ تیز رفتار دریائے سندھ کا ٹمیالا پانی ________ حدِ نظر تک بکھری ہوئی برف پوش اور فلک بوس پہاڑی چوٹیاں ________ یہ نظارہ دنیا کے کسی اور ملک میں میسر نہیں ________ اس نے اس خوبصورت منظر سے اپنے ذوقِ نظر کی تسکین کا سامان کیا ________ اسی روز سکردو کا فضائی معائنہ کر کے وہ سہ پہر واپس راولپنڈی پہنچ گئے ________ اگر جیکسن کی رفاقت میسر نہ آئی ہوتی تو وہ سکردو کی اس خوبصورت سیاحت سے محروم رہ گیا ہوتا اور یہ محرومی تا زیست اس کے لیے تاسف کا باعث رہتی۔

سری نگر کا دورہ

چند ہفتے قبل اس نے پاکستان میں موجود اقوام متحدہ کے حکام کو اس امر کی درخواست دی تھی کہ وہ براستہ چکوٹھی سری نگر جانے کا خواہشمند ہے لہذا اسے اس کی اجازت دی جائے۔ اس کی یہ معصوم سی خواہش اقوام متحدہ سمیت بھارت اور پاکستان کی حکومتوں اور آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کی انتظامیہ کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی۔ خطوط، ٹیلیفون اور ٹیلیگرام کے ذریعے اقوام متحدہ اور پاک بھارت حکومت کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ چل

نکلا_______ بھارت کو مسٹر سٹیفن کے دورہ سری نگر کے روٹ پر اعتراض تھا۔ وہ اسے واہگہ کے راستے سرینگر کا سفر اختیار کرنے کی اجازت دینے کو تو بخوشی تیار تھا تاہم براستہ چکوٹھی سیز فائر لائین عبور کر کے سرینگر جانے کی اجازت دینے پر آمادہ نہ تھا جبکہ پاکستان کو اس کے براستہ چکوٹھی سرینگر جانے پر قطعاً کوئی اعتراض نہ تھا۔ اقوام متحدہ کے نمائندوں کے اصرار پر بالاخر بھارت بھی بادلِ نخواستہ براستہ چکوٹھی سرینگر جانے کی اجازت دینے پر راضی ہو گیا۔

۱۸/اپریل کو اسے اقوام متحدہ کی جانب سے ایک غیر حتمی اطلاع ملی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا کیونکہ ۱۹۴۷ء کی جنگ کے بعد وہ پہلا (اور شاید ۷/اپریل ۲۰۰۵ مظفر آباد سرینگر بس سروس کے اجراء تک واحد) شخص تھا جسے تاریخی مظفر آباد سرینگر روڈ کے ذریعے سفر کرنے کا موقع مل رہا تھا۔

اپنی روانگی سے ایک روز قبل وہ راولپنڈی میں اقوام متحدہ کے ایک افسر سے الوداعی ملاقات کرنے گیا۔ اس آفیسر نے اس کے دورہ سرینگر کو ممکن بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مسٹر سٹیفن اس وقت چترالی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ ایسی ٹوپی تقریباً سارے صوبے سرحد میں پہنی جاتی ہے۔ اقوام متحدہ کے افسر نے اسے ایسی ٹوپی پہن کر سرینگر جانے سے منع کیا کیونکہ سرینگر میں ایسی ٹوپی پہن کر جانے والے کو پٹھان سمجھا جا سکتا تھا جو اس وقت سری نگر کی انتظامیہ کے نزدیک نہایت قابلِ نفرت مخلوق تھی۔ اس نے سرینگر کے سفر کو محفوظ اور شکوک وشبہات سے پاک بنانے کے لیے چترالی ٹوپی کی بجائے ہیٹ پہن لیا۔ وہ اپنا کیمرہ لے جانا چاہتا تھا لیکن اس کی اجازت بھارتی حکومت کی طرف سے نہ تھی۔ اسی طرح اہم دستاویزات اور دوران سفر تیار کردہ نوٹس بھی سرینگر کے پُر خطر سفر پر ساتھ لے جانا ممکن نہ تھا۔ اس نے اپنی دستاویزات اور نوٹس کو راولپنڈی میں ہی ایک بینک کے لاکر میں محفوظ کر لیا۔

یہ اپریل کے گریز پا دن تھے۔ موسم میں خاصی حدت آچکی تھی۔ اب وہ راولپنڈی سے مظفر آباد پہنچ چکا تھا۔ یہاں اس نے دومیل میں فوجی ہیڈ کوارٹر میں قیام کیا۔ دومیل میں جہاں 1 اے کے بریگیڈ کا ہیڈ کوارٹر ہے، اس وقت بھی اس کی حیثیت بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کی تھی تاہم اس وقت آزاد جموں و کشمیر کی مسلح افواج، افواج پاکستان کا حصّہ نہ تھیں اور یہ ہیڈ کوارٹر آزاد جموں و کشمیر کی ریگولر فورسز کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ہیڈ کوارٹر سے ملحقہ اقوام متحدہ کے آبزرور مشن کا دفتر تب بھی اسی طرح قائم تھا جیسا کہ اب ہے۔ اس وقت دو امریکی، ایک آسٹریلوی، ایک بلجیئن اور ایک برطانوی فوجی مبصر قیام پذیر تھے۔ یہاں اس نے آزاد کشمیر فورسز کے جوانوں سے مقبوضہ کشمیر کے لیے غلام کشمیر کی اصطلاح سُنی جس پر اسے خاصا تعجب ہوا لیکن سری نگر کی سیاحت کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ اصطلاح ناگوار سہی لیکن بے محل نہیں۔ یہاں اسے اقوام متحدہ کے مبصرین کے ساتھ گپ شب کرتے ہوئے دلچسپ واقعات سننے کو ملے ______ آزاد کشمیر سائیڈ کے ایک بریگیڈئر نے اقوام متحدہ کے مبصرین کو اطلاع دی تھی کہ آزاد کشمیر کے علاقے سے بھیڑوں کا ایک گلہ چرتے چرتے مقبوضہ علاقے میں داخل ہو گیا ہے جس کے ساتھ چرواہے نے بھی غلطی سے سیز فائر لائن عبور کر لی ہے لہذا ان کی واپسی کا بندوبست کیا جائے۔ اقوام متحدہ کے اہلکار نے وائرلیس پر بھارتی بریگیڈئیر سے کہا کہ بھیڑیں ابھی تک نقشہ خوانی کی تربیت حاصل نہ کر سکی ہیں اور غلطی سے سیز فائر لائن عبور کر گئی ہیں لہذا انہیں واپس کر دیا جائے۔ اس طرح بھیڑوں کی چرواہے سمیت واپسی کا فوری انتظام ہو گیا۔ اسی طرح کچھ بھارتی سپاہی غلطی سے آزاد علاقے میں داخل ہو گے تھے۔ انہیں آزاد فورسز نے گرفتار کر لیا تھا، اقوام متحدہ کی مداخلت سے ان کی رہائی بھی عمل میں آئی۔

رات مظفر آباد قیام کے بعد دوسرے دن وہ اقوام متحدہ کی گاڑی میں براستہ

چکوٹھی سرینگر کے لیے روانہ ہوا۔ کچھ پاکستانی آفیسر بھی اس کے ہمراہ تھے جو اسے چکوٹھی تک رخصت کرنے آئے تھے۔اس کی گاڑی جہلم ویلی روڈ پر سرینگر کی جانب رواں دواں تھی ــــــ پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی جہلم کبھی اتنی تنگ ہو جاتی کہ اسے اپنے دائیں بائیں بلند و بالا پہاڑوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دیتا اور کبھی اس قدر کشادہ ہو جاتی کہ دائیں بائیں بنے ہوئے مٹی کے کچے گھر، ان کے قریب پھیلے ہوئے کھیت اور عقب میں ایستادہ چیل کے درختوں کے زیور سے آراستہ سرسبز پہاڑ اسے دعوت نظارہ دیتے ــــــ بعض شکستہ بستیاں اور دریائے جہلم پر ٹوٹے ہوئے پُل کچھ ہی عرصہ قبل لڑی جانے والی جنگِ آزادی کی یاد دلا رہے تھے۔ اکا دکا بھارتی طیارے اب بھی منڈلاتے ہوئے آتے اور شہری آبادی، عمارتوں اور پلوں کو بلا اشتعال نشانہ بنا جاتے تھے۔ چالیس میل کے سفر کے بعد وہ سیز فائر لائین پر واقعہ قصبہ چکوٹھی پہنچ گیا۔ پاکستانی فوجی چوکی کے انچارج کیپٹن نے مسٹر سٹیفن اور اقوام متحدہ کے مبصرین کے لیے دن کے کھانے کا بندوبست کیا ہوا تھا لیکن بھارتی حکام نے مقبوضہ حصے میں ان کے داخلے کے لیے کڑی شرائط اور ٹائم ٹیبل کا تعین کر رکھا تھا جس میں معمولی سی تاخیر بھی بھارتی حکام کے لیے انکار کا جواز فراہم کر سکتی تھی۔ لہذا سٹیفن نے اقوام متحدہ کے حکام کے مشورے سے کھانے کی اس دعوت سے معذرت کر لی۔

اقوام متحدہ کی تین سفید جیپوں اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستانی فوج کی ایک جیپ پر مشتمل یہ قافلہ چکوٹھی قصبے سے کنٹرول لائین کے لیے روانہ ہوا۔ طے پایا تھا کہ کنٹرول لائین پر No Man Land میں اقوام متحدہ کے حکام سٹیفن کی موجودگی میں پاکستانی اور بھارتی حکام اکھٹے چائے پئیں گے۔ پاکستانی جیپ پر چائے کے لوازمات بھی رکھے گئے تھے۔ سٹیفن کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ No Man land ایک تنگ نالے پر مشتمل تھی جس کے ایک طرف آزاد کشمیر اور دوسری طرف مقبوضہ کشمیر کا علاقہ تھا۔ درمیان

میں نالے پر ایک پل نیم شکستہ حالت میں موجود تھا۔ پل کے ایک طرف پاکستانی سنتری پوسٹ اور بیریئر نصب تھا اور دوسری طرف بھارتی سنتری پوسٹ اور بیریئر ـــــ ان دونوں کے درمیان کا مختصر سا علاقہ ہی No man land تھا۔

ابھی مسٹر سٹیفن سیز فائر لائین اور no man land پر غور کر ہی رہا تھا کہ ایک پاکستانی فلائٹ لیفٹینینٹ مسٹر احمد، جو اس کے ہمراہ راولپنڈی سے آیا تھا، نالے سے پار بھارتی فوجیوں میں سے ایک افسر کو دیکھ کر چلانے اور اسے آوازیں دینے لگا۔ ''نائر'' ـــــ ''نائر'' ـــــ دوسری طرف سے نائر نے بھی اسی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا ـــــ احمد نے اپنی اس اچانک اور معصومانہ سی حرکت پر حیرت میں مبتلا ہجوم کو بتایا کہ وہ اور مسٹر نائر نہ صرف دوست اور کلاس فیلو رہے ہیں بلکہ ہاسٹل میں روم میٹ بھی رہے ہیں۔ اب وہ دونوں دو متحارب افواج سے وابستہ تھے۔ نائر بھارتی فوج میں کپتان کے عہدے پر فائز تھا جبکہ احمد پاکستان ائرفورس میں فلائیٹ لیفٹننٹ تعینات تھا۔ تھوڑی دیر بعد نومین لینڈ میں چائے کی ایک ہلکی پھلکی دعوت میں مسٹر احمد اور نائر آپس میں بغلگیر تھے۔ بدقسمتی سے دوستی کے لیے چند لمحات بڑے گریز پا ثابت ہوئے اور مسکراہٹیں چہروں سے غائب ہو گئیں۔ دونوں اطراف کے فوجی اپنی اپنی پوزیشنوں پر چلے گئے کسی کو اندازہ نہ تھا کہ کچھ دیر قبل اکھٹے چائے کی چسکیاں لینے والے متحارب فوجی تھوڑی ہی دیر بعد فائرنگ کے تبادلے میں مصروف ہو جائیں گے۔

پاکستانی فوجی حکام نے مسٹر سٹیفن کو چکوٹھی پل سے رخصت کیا۔ اب وہ اقوام متحدہ کی سفید جیپ میں سوار چکوٹھی سے سرینگر کے لیے روانہ ہو گیا۔ احمد کا دوست نائر بھی ایک بھارتی فوجی جیپ میں سوار اس کے قافلے میں شامل تھا۔ ان کا قافلہ ایک تنگ اور شکستہ سڑک پر رواں دواں تھا۔ اوڑی میں بھارتی فوج کے کرنل مسٹر سریناواسن اور میجر شرما نے

اس کا استقبال کیا۔ یہاں اس نے دن کا کھانا کھایا اور اپنی منزل، سری نگر کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ بل کھاتی سڑک پر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک سکھ بٹالین کے پاس سے ان کا گزر ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں جب اس نے بھارت کو خیر آباد کہا تھا، اسے ابھی تک شاید کوٹلی میں سیز فائر لائین کے دورہ کے موقع پر ایک آدھ سکھ کی ''زیارت'' نصیب ہوئی تھی۔ یہاں تنومند، چاک و چوبند، پگڑیوں میں ملبوس گھنی لمبی سیاہ ڈارھیوں سے مزین چہرے والے سکھوں کو اتنی بڑی تعداد میں دیکھ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ایسے ہی جذبات کا اظہار اس نے وزیرستان کے محسود قبائل کے جفاکش جوانوں کو دیکھ کر بھی کیا تھا، وادی ہنزہ میں گورے چٹے صحت مند افراد کے بارے میں بھی اس کے جذبات اسی طرح کے تھے۔ تراڑکھل سے پلندری کے پیدل سفر کے دوران اپنا استقبال کرنے والے بہادر سدھنوں کے بارہ میں بھی اُس نے اسی طرح کے تحسین آمیز کلمات استعمال کیئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی یہ دلچسپی خاص سکھوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ مضبوط جسامت کے تنومند اور چاک و چوبند جوانوں کو دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔

سورج کی تمازت کچھ دیر قبل تک گرمی کا احساس دلا رہی تھی لیکن اب گھرے بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج نے ماحول کو خاصا خنک اور کسی حد تک ہیبت ناک بنا دیا تھا۔ جیپ پر نصب ترپال کے اطراف سے پانی رس رس کر اندر آ رہا تھا جس سے اس کا جسم بھیگ چکا تھا۔ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے اس کا قافلہ بارہ مولا پہنچا جہاں اس نے کپڑے تبدیل کیئے اور ایک گرم کمبل میں گھس کر سردی سے نجات حاصل کی۔ بارش تھمنے پر اس نے بارہ مولا شہر کا گھوم پھر کر نظارہ کیا۔ اس کا بیان ہے کہ ۱۹۴۷ء کی قبائلی یلغار سے یہ شہر اس قدر متاثر نہیں ہوا جتنا بھارتی حکومت کی طرف سے جاری کی جانے والی تصاویر اور سرکاری پروپگنڈے کے ذریعے ظاہر کیا جا رہا تھا۔ کرنل شرینا واسن

اور میجر شرما اس کی توجہ بار بار ان عمارات کی جانب مبذول کرانے کی کوشش کررہے تھے جو بقول ان کے، قبائلی حملے سے تباہ ہوئی تھی، جن میں کانونٹ سکول اور رومن کیتھولک چرچ کی عمارات بھی شامل تھیں۔ وہ مسٹر سٹیفن کے مذہبی جذبات کو قبائلی مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا چاہتے تھے۔ لیکن سٹیفن نے کسی گہری دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔

اس کی منزل سرینگر تھی۔ دونوں اطراف سفیدے اور چنار کے درختوں سے ڈھکی ہوئی بارہ مولا سرینگر روڈ پر اس کا قافلہ رواں دواں تھا۔ راستے میں کرنل شرینا واسن اور میجر شرما اس سے پاکستانی فوج کے معیار، تنظیم، تربیت، صلاحیت اور کارکردگی، پیشہ وارانہ مہارت، مورال وغیرہ کے بارے میں دلچسپ سوال پوچھتے رہے کیونکہ وہ ابھی ابھی آزاد کشمیر اور پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد وادی کشمیر میں داخل ہو رہا تھا اس لحاظ سے پاکستان اور افواج پاکستان کے بارہ میں اس کے پاس تازہ ترین معلومات تھیں۔ سری نگر میں اس کا قیام ''نیڈوز'' میں تھا جو ایشیاء کے بہترین ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا۔

دوسرے دن ہوٹل کے برامدے میں چہچہاتے پرندوں کے رس بھرے نغموں سے اس کی آنکھ کھلی ____ اس نے نیڈوز کے برامدے سے وادی کے حسن کا جی بھر کر نظارہ کیا ____ صحن کی سبز گھاس میں کھلے ہوئے رنگ برنگے پھول ____ ذرا فاصلے پر اُگے ہوئے بلند و بالا دیودار کی قطاریں، پس منظر میں جھیل ڈل، آسمان پر اُڑتے ہوئے آوارہ بادل ____ ہولے سے چلنے والی بادِ نسیم ____ وادی کشمیر تو ایشیا میں ہے لیکن اسے یورپ کی بہاروں کا پرتو اس وادی میں نظر آیا ____ پاک بھارت کشیدگی نے اس شہر کے حسن کو ماند کر دیا تھا ____ سری نگر پہنچنے کا آسان ترین اور قریب ترین راستہ وہی تھا جس سے مسٹر سٹیفن آیا تھا لیکن سیز فائر لائین نے اس راستے کو مسدود کر کے وادی کشمیر کو باہر کی دنیا سے کاٹ دیا تھا ____ اب اکا دکا سیاح ہی ادھر کا

رخ کرتے تھے ـــــــــ لوگوں کا کاروبار ماند پڑ چکا تھا۔

سٹیفن صبح کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہونے باہر نکل آیا اور دریائے جہلم کے کنارے سڑک پر چلنے لگا ایک یورپی سیاح کو دیکھ کر فلاکت زدہ انسانوں کا ایک ہجوم اس کے پیچھے چلنے لگا۔ کوئی ٹیکسی ڈرائیور تھا جو اسے اپنی ٹیکسی میں سوار کرنا چاہتا تھا، کوئی ہاؤس بوٹ مالک تھا جو اسے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرانے کے درپے تھا۔ کوئی اس کے ہاتھ پیپر ماشی کے نمونے فروخت کرنا چاہتا تھا ـــــــــ کوئی شال کا تاجر تھا اور کوئی قالین فروش ـــــــــ سب نے اس پر یلغار کر دی ـــــــــ اس نے بھاگ کر جان چھڑائی ورنہ یہ لوگ تو اس کے کپڑے پھاڑنے پر تلے ہوئے تھے ـــــــــ

ایسی صورت حال سے دوچار ہونے والا سیاح کشمیریوں کے بارہ میں بڑا منفی تاثر لیتا ہے اور انہیں لالچی، چاپلوس، دوہری شخصیت اور کمزور کردار کا حامل سمجھ لیتا ہے، لیکن کشمیریوں کے بارہ میں یہ تاثر درست نہیں ۔ وہ بڑے محبت کرنے والے، مخلص، ملنسار، ہمدرد اور شفیق و خلیق ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس قومِ نجیب وتر دماغ و چرب دست کو تاریخ نے ہمیشہ تختہ مشق ستم بنایا ہے۔ مغلوں، افغانوں، سکھوں اور ڈوگروں کی صدیوں پر محیط غلامی نے ان پر بے پناہ مظالم ڈھائے ہیں ۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کی صورت حال نے انہیں مستقل سیاسی بے یقینی کے غار میں دھکیل دیا ہے۔ ان حالات میں کسی کشمیری باشندے سے بظاہر عمدہ انسانی اوصاف کے مغائر طرز عمل کا ارتکاب سارے کشمیریوں کا طرز عمل قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس کے بارہ میں رائے قائم کرنے سے قبل ان حالات اور اس پس منظر کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس کا اہل کشمیر گزشتہ ساڑھے تین صدیوں سے شکار ہیں۔

سٹیفن نے اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں کشمیریوں کے بارہ میں پائے جانے والے منفی تاثر کی نفی کی ہے۔ اس نے سرینگر میں ایک درزی سلطان محمد کو کوٹ سلائی کے لیئے

دیا تھا۔ درزی نے اسے اتنا شاندار کوٹ تیار کر کے دیا کہ اسے افسوس ہوا کہ اس نے محض کوٹ کی بجائے پورا سوٹ کیوں نہ سلوالیا۔ اس نے درزی سے اس کا اظہار کیا تو درزی نے کہا ''کوئی بات نہیں صاحب! آپ حکم کریں۔ میں سوٹ تیار کر دیتا ہوں'' لیکن سٹیفن کے پاس صرف ایک دن باقی تھا۔ درزی نے نہایت محنت اور مہارت سے ایک دن میں سٹیفن کو عمدہ سوٹ تیار کر کے دیا۔ اس عجلت میں کام کرنے کی اس نے نہ صرف یہ کہ کوئی اضافی مزدوری نہ لی بلکہ سٹیفن نے بطور بخشش اسے کچھ اضافی رقم دینے کی کوشش کی جو اس نے شکریہ کے ساتھ واپس کر دی اور معمولی مزدوری پر اسے اتنا عمدہ سوٹ تیار کر دیا جو وہ خوشی سے برطانیہ کی سفارتی تقریبات میں زیب تن کر سکتا تھا۔

۲۱/اپریل کو اس کی ملاقات شیخ محمد عبداللہ سے طے تھی جو اس وقت مقبوضہ جموں و کشمیر کے وزیراعظم تھے۔ جی ہاں! اس وقت مقبوضہ کشمیر میں بھی اسی طرح صدر اور وزیراعظم کا منصب برقرار تھا جس طرح آزاد جموں و کشمیر میں اب تک ہے ______ شیخ عبداللہ اس وقت ایشیا کے سب سے زیادہ متنازع لیڈر تھے۔ ریاست کے مستقبل کے حوالے سے شیخ عبداللہ کا متنازعہ سیاسی فیصلہ ہی جنوبی ایشیاء میں سیاسی کشیدگی کا باعث تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس اور ہندو قیادت انہیں ہیرو کے روپ میں پیش کر رہی تھی جب کہ مسلم لیگ اور برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت انہیں مسلم کاز سے غداری کا مرتکب قرار دے رہی تھی۔

مضبوط جسم، دراز قد، سرخ و سفید رنگت کے حامل پچاس سالہ شیخ محمد عبداللہ سے مسٹر سٹیفن کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ شیخ عبداللہ کے بارہ میں اسے یہ بتایا گیا تھا کہ وہ ایک غریب شال باف کا بیٹا ہے اور غریب عوام کا ہمدرد و غمگسار اور سادہ طرز زندگی بسر کرتا ہے لیکن جب وہ ''غریبوں کے اس راہنما'' کی رہائش گاہ پر پہنچا تو بہترین آراستہ و پیراستہ رہائش گاہ، بڑا اور عمدہ باغ اور اعلیٰ نسل کے پالتو کتے دیکھ کر اسے یہ شک گزرا کہ وہ شیخ

عبداللہ کی رہائش گاہ پر نہیں بلکہ یورپ کے کسی دولت مند لارڈ کے بنگلے پر آ پہنچا ہے۔ دریں اثنا غریب شال باف کا یہ بیٹا شیخ محمد عبداللہ نیلے رنگ کے قیمتی سوٹ اور ٹائی میں ملبوس اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔ لیکن اس میں شیخ صاحب کا کیا قصور، غریب ممالک کے سبھی غریب لیڈر سب سے پہلے اپنی غربت دور کرتے ہیں۔ یہ طویل ملاقات بھی ایک ایسے مرحلے پر ہوئی جب شیخ صاحب پنڈت نہرو کی آنکھ کا تارا رہنے کے بعد اب کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے تھے ____ اس کی وجہ یہ تھی کہ چند ہی روز قبل انہوں نے رنبیر سنگھ پورہ میں ایک ایسی تقریر کی تھی جس پر بھارتی قیادت نے شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا ____ اگرچہ سٹیفن کے ساتھ اس ملاقات میں انہوں نے کشمیر کے تنازعہ پر بھارتی موقف کی بھرپور وکالت کی اور اپنی رنبیر سنگھ پورہ والی تقریر کے اثرات زائل کرنے کی کوشش کی لیکن کانگریسی قیادت سے ان کے فاصلے بڑھنے شروع ہو گئے تھے۔ اب کہ دل کا جانا ٹھہر گیا تھا۔

تین گھنٹے پر محیط اس انٹرویو کی تفصیلات سٹیفن نے اپنی کتاب بیان نہیں کیں البتہ شیخ صاحب کے حوالے سے اپنے تاثرات اور ان کی طرف سے پاکستان کی بجائے بھارت کے ساتھ کشمیر کی قسمت وابستہ کرنے کے فیصلے کے محرکات کا تجزیہ کیا ہے۔ مصنف کے نزدیک قبائلی حملہ اور لوٹ مار کی داستانیں محض بہانہ تھیں جن کی آڑ میں پاکستان کو بدنام کرنے کی منظم مہم چلائی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ قبائلیوں نے بھی بعض مقامات پر لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا ارتکاب کیا ہے جسے کسی طور پر پسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا تاہم قبائلیوں کے مظالم کا تناسب اس قتل و غارت گری کہیں کم ہے جس کا مظاہرہ انتہا پسند ہندو تنظیموں شیوسینا اور آر ایس ایس کے کے ہاتھوں جموں میں مسلمانوں کے اجتماعی قتل عام، پونچھ اور میر پور میں ڈوگرہ فوجوں کے مظالم اور بعد میں بھارتی جنگی طیاروں کی بمباری کی

صورت میں ہوا ہے۔ اپنی گفتگو میں شیخ صاحب نے قبائلی لشکریوں کی لوٹ مار کی وہی رٹی رٹائی کہانیاں دہرائیں جو گزشتہ کئی سال سے بھارتی پریس میں تواتر سے شائع ہوتی رہی ہیں اور جن کی صحت وصداقت کی آزاد ذرائع سے کبھی تصدیق نہیں ہوسکی۔ مسٹر سٹیفن کے نزدیک قبائلی لوٹ مار محض ایک بہانہ ہے۔ شیخ عبداللہ کی جانب سے بھارت کی مدد وحمایت کی وجوہات اور ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

الف:۔ شیخ عبداللہ کے نزدیک کشمیر اور کشمیری عوام کے مستقبل سے زیادہ اہمیت اپنے ذاتی مستقبل کی ہے۔ کانگریس کے ساتھ ان کا دیرینہ قلبی تعلق کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ ان کی سوچ وفکر پر کانگریس کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ ان کی نیشنل کانفرنس اور انڈین نیشنل کانگریس کا آپس میں ''من تو شدم تو من شُدی'' کا تعلق ہے۔ شیخ صاحب کے ذاتی دوستوں کا حلقہ بھی کانگریسی قائدین پر مشتمل ہے جب کہ قائدِاعظم محمد علی جناح اور مسلم لیگ کے ساتھ ان کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ مسلم لیگ کا ساتھ دینے کی صورت میں ان کی حیثیت ایک دوسرے درجے کے لیڈر کی ہوتی اور انہیں محمد علی جناح کی قیادت تسلیم کرنی پڑتی جو کہ ان کی انا پرست طبیعت کو گوارا نہ تھی۔ اس طرح انھوں نے اپنے ذاتی میلان طبع، قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ اپنی ذہنی عدم ہم آہنگی، پنڈت نہرو اور دیگر کانگریسی قائدین کے ساتھ ذاتی دوستی اور اپنے سیاسی مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھارت کے ساتھ الحاق کے متنازعہ ترین فیصلے کی تائید وحمایت کی نہ کہ کشمیری عوام کی آرزوؤں، ریاست کے جغرافیائی محل وقوع، دفاعی اور اقتصادی مفادات اور تقسیم ہند کے اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔

ب: ۱۹۴۷ء کے آغاز تک ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کا قیام ایک

دیوانے کا خواب ہی لگتا تھا ______ اس وقت کانگریسی سوچ رکھنے والے مسلم راہنماؤں کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ قیام پاکستان جسے وہ ناممکن الوقوع سمجھتے ہیں، چند ہی ماہ میں حقیقت کا روپ دھار لے گا۔ ۳ رجون ۱۹۴۷ء کو اچانک تقسیم ہند کا منصوبہ سامنے آیا اور دو اڑھائی ماہ کے اندر اندر ہندوستان آزاد ہو کر بھارت اور پاکستان پر مشتمل دو آزاد ریاستوں کی صورت میں تقسیم ہو گیا۔ شیخ محمد عبداللہ اس عرصہ میں جیل میں رہے اور جیل میں ہونے کے باعث وہ بدلتے ہوئے حالات کا مشاہدہ کر کے درست فیصلہ کرنے میں ناکام رہے۔ اگر انہیں اندازہ ہوتا کہ قیام پاکستان کا خواب یوں شرمندہ تعبیر ہو جائے گا تو برضا و رغبت نہ سہی، مجبوراً ہی سہی، ممکن تھا کہ وہ پاکستان سے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا سوچتے لیکن انہیں اس کا موقع ہی نہ مل سکا اور نہ وہ حالات کا درست تجزیہ کر پائے۔ اپنے فیصلے کی اصابت کے بارہ میں وہ خود بھی زیادہ مطمئن نہیں رہے لیکن اپنی غلطی کو درست ثابت کرنے کے لیے قبائلی لوٹ مار کا کارڈ وہ بھی بھارت سے استعمال کرتے رہے ہیں۔

ج: دیگر کانگریسی مسلمان قائدین مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی، خان عبدالغفار خان وغیرہ کی طرح شیخ صاحب کا بھی یہی خیال تھا کہ پاکستان اگر بن بھی گیا تو قائم نہ رہ سکے گا اور واپس بھارت میں ضم ہو جائے گا لیکن گزشتہ پانچ سال اور الحمد للہ ساٹھ سال کے دوران نہ صرف یہ کہ ایسا کوئی حادثہ رونما نہیں ہوا بلکہ پاکستان روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے جب کہ کشمیر کے پاکستان کے ساتھ تجارت اور آمد و رفت کے فطری راستے بند ہو جانے کے نتیجے میں کشمیر میں عام آدمی کی

اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جارہی ہے۔ایسے میں شیخ صاحب
اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے اپنے غلط فیصلے کو درست ثابت کرنے کے
لیے دور کی کوڑی لا رہے ہیں اور قبائلی یلغار جیسے کھوکھلے جواز تراش رہے
ہیں۔ایسے دلائل سے وہ اپنے آپ کو تو شائد مطمئن کرلیں، تاریخ کو کیسے
مطمئن کر پائیں گے؟

مصنف نے شیخ عبداللہ کی انتظامیہ میں ہندو مسلم اور سکھ اتحاد کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ شیخ صاحب کی قیادت میں وادی کشمیر فرقہ وارانہ فساد سے محفوظ رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وادی کشمیر میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں شیخ عبداللہ کی حکومت کا کوئی کمال نہیں بلکہ اس کا کریڈٹ ریاست کی مسلم اکثریت کو جاتا ہے جس کے غیر فرقہ وارانہ اور فراخدلانہ طرز عمل سے وادی کشمیر کے ہندو پنڈت محفوظ و مامون ہیں جبکہ جموں، جہاں ہندو کثریت تھی، شیخ عبداللہ انتظامیہ فسادات کو نہ روک سکی اور لاکھوں مسلمان گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالے گئے۔

۲۲ اپریل کو مسٹر سٹیفن سری نگر سے واپسی کے لیے روانہ ہوا۔ واپسی سے قبل اس نے کشمیری مسلمانوں کی روحانی مرکز درگاہ حضرت بل میں حاضری دی یہ حضور نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کا دن تھا اور کشمیری مسلمان پروانہ وار حضرت بل اُمڈ آئے تھے۔ حضرت بل کی زیارت کے بعد اس نے مہاراجہ ہری سنگھ کا محل دیکھا جسے اب زیر تجویز کشمیر یونیورسٹی میں ضم کرنے کا منصوبہ بنایا جارہا تھا۔ اس نے برطانوی دور کی ریزیڈنسی بھی دیکھی جسے اب کشمیر ہیڈی کرافٹ ایمپوریم میں تبدیل کیا جاچکا تھا۔ نشاط باغ، شالیمار باغ اور نسیم باغ کا نظارہ کرنے کے بعد وہ واپسی کے لیے روانہ ہوا۔

واپسی پر اس نے بارہ مولا میں ''ڈبلنگم پیلس'' میں ناشتہ کیا۔ جی ہاں! یہ اس ہاؤس

بوٹ کا نام تھا جسے بھارتی قابض فوج اپنی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کر رہی تھی ۔ یہ عظیم الشان ہاؤس بوٹ برطانوی سیاحوں کو دریائے جہلم کی سطح آب پر تفریح و قیام کی سہولت بہم پہنچانے کے لیے تعمیر کی گئی تھی لیکن اب اس میں بھارتی فوج کا ایریا کمانڈر لیفٹننٹ کرنل شرینا واسن اپنے سٹاف کے ہمراہ قیام پذیر تھا۔ سری نگر سے واپسی پر اس نے سٹیفن کو اسی ''بکنگھم پیلس'' میں ناشتہ پر مدعو کیا تھا۔

بارہ مولا پہنچ کر اس نے کانونٹ ہسپتال کا بھی دورہ کیا جو اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قبائلی حملے کے دوران بری طرح متاثر ہوا تھا۔ اس حملے کے دوران ایک نن قتل کر دی گئی تھی جب کہ ایک بُری طرح زخمی ہوئی تھی ۔ بعد میں قبائلی حملہ آور اس ہسپتال کو اپنے ہیڈ کوارٹر کے طور پر بھی استعمال کرتے رہے۔ قبائلی حملہ آوروں کی لوٹ مار اور توڑ پھوڑ سے جو کچھ بچ گیا تھا وہ بھارتی طیاروں کی گولہ باری کی نذر ہوا۔

گھر کو آگ لگی، سامان جو بچا تھا جلنے سے
وہ بھی ان کے ہاتھ لگا، جو آگ بجھانے آئے تھے

اس ہسپتال کی تباہی کی کہانی بھارتی ذرائع ابلاغ نے دنیا بھر میں قبائلی مظالم کا ڈھنڈورا پیٹنے اور پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کی تاہم اس تباہی میں قبائلی حملہ آوروں کے ساتھ ساتھ بھارتی فوج کی فائرنگ اور فضائیہ کی بمباری کا بھی بڑا حصہ تھا۔ اس ہسپتال کی اگرچہ اب مرمت ہو چکی تھی تاہم لوگ اب بھی یہاں مریضوں کو داخل کرنے سے ڈرتے تھے۔

کانونٹ ہسپتال کا معائینہ کرنے کے بعد وہ اقوام متحدہ کی جیپ میں واپس آزاد کشمیر کے لیے روانہ ہوا۔ چکوٹھی کے مقام پر بھارتی فوجی حکام نے اسے الوداع کہا اور آزاد کشمیر کے فوجی افسران نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے رات مظفر آباد میں گزاری اور

دوسرے دن براستہ ایبٹ آباد پشاور کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کا دورہ کشمیر مکمل ہو چکا تھا______ لیکن محض جغرافیائی اعتبار سے______ یعنی اس نے ریاست کی جغرافیائی سرحدوں کو خدا حافظ کہہ دیا تھا لیکن ریاست جموں وکشمیر کا دورہ اس وقت تک مکمل نہیں قرار پا سکتا تھا جب تک اس کی ملاقات چوہدری غلام عباس، صدر آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس سے نہ ہو جاتی۔ وہ ان دنوں ایبٹ آباد میں قیام پذیر تھے۔ سٹیفن نے ایبٹ آباد کی خنک اور خوشگوار فضا میں ان سے ملاقات کی۔ چوہدری غلام عباس مغربی طاقتوں خصوصاً امریکہ اور برطانیہ کی جانبدارانہ پالیسیوں کے شاکی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے جنگ عظیم دوئم کے موقع پر مغربی اتحادی قوتوں کا ساتھ دیا جب کہ کانگریس نے عدم تعاون کا طرز عمل اختیار کیا لیکن مغربی ممالک خصوصاً برطانیہ اور امریکہ نے کشمیر کے مسئلہ پر بھارت کی خاموش حمایت کر کے مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ مغرب مسلمانوں کی مخالفت کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ انہوں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ مغربی طاقتیں پاکستان اور بھارت دونوں سے دوستی کا دعویٰ کرتی ہیں لیکن ان کے باہمی تنازعات میں ان کا جھکاؤ ہمیشہ بھارت کے حق میں ہوتا ہے۔ اگر مغرب بھارت اور پاکستان دونوں کا حقیقی دوست ہے تو اس دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں ممالک کے باہمی تنازعات کو حق وانصاف کی بنیاد پر حل کرنے میں اپنا کردار ادا کرے۔ اس کے بغیر دونوں ممالک کا دوست ہونا اور دونوں کا دشمن ہونا ہم معنی ہے۔

مسٹر سٹیفن نے چوہدری غلام عباس کو خوبصورت اور قد آور سیاسی رہنما قرار دیا ہے جن کی ذہنی سطح (Intellectual level) ان کے سیاسی حریف شیخ محمد عبداللہ سے بلند تر ہے تاہم کیا وہ قائدانہ صلاحیتوں میں بھی شیخ صاحب سے بہتر یا کم از کم ان کے برابر ہیں؟ جموں وکشمیر کی پیچیدہ سیاسی صورت حال میں اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ دونوں

راہنما ماضی میں ایک دوسرے کے دوست رہے ہیں۔ دونوں نے ایک ہی جماعت (آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس) میں اکھٹے کام کیا ہے۔ دونوں ریاست جموں و کشمیر کے باشندوں کی ترقی و خوشحالی چاہتے ہیں۔ دونوں ہی محبّ وطن ہیں۔ دونوں میں یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ انہیں اگر بیرونی مداخلت یا داخلی مجبوریوں سے بالاتر ہو کر علیٰحدگی میں باہم مل بیٹھ کر مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ بہتر حل تلاش کر سکتے تھے لیکن یہ مرحلہ بہت پہلے گزر چکا ہے۔ اگر تنازعہ کشمیر کے آغاز پر ہی دونوں راہناؤں کو ایسا موقع فراہم کیا جاتا تو شاید اس بدقسمت ریاست کا نقشہ آج مختلف ہوتا۔ اب تو کشمیریوں کے دوست میدان میں اتر چکے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ کشمیریوں کے دوست ہی ان کے دشمن بھی ہیں۔ اب کشمیریوں کے ہاتھ میں کچھ نہیں ______ فیصلہ اب ان کے دوستوں کے ہاتھ میں ہے ______!

چوہدری غلام عباس سے ملاقات کے بعد سٹیفن پشاور روانہ ہو گیا۔

کتابیات

اس کتاب کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

Author	Book	Publisher
(1) G.T.Wigne	Travells in Kashmir Laddakh and Skardu	Indus Publications Karachi1987
(2)William Moor Craft and George Terebeck	Travel in Himalian Provinces in Punjab,Kashmir,Laddakh Peshawar,Kabul,Kundar,and Bukhara.	Oxford University Press ,1977
(3) Baron Charles Hugel	Travels in Kashmir and the Punjab	JohnPetheran London ,1845
(4) Fredric Drew	Northern Barriers of India	London,1845
(5) E.F.Knight	Where three Empires meet	Ali Pubshers Lahore,1996
(6)John Collettle	Tourist Guide for visitors to Kashmir	Newman & Co. Calcutta, 1884
(7)Margaret Cotter Morison	Travels in the Mughal Empire 1656	Duck worth & Co.London,1904

(8) Francois Bernier	شاہجہاں کے ایام اسیری اور اورنگ زیب کا عہد	Munshiram Manohar Lal publishers New Delhi,1983
(9)Sir Walter Lawrence.I.E.S.C.I.E	The valley of Kashmir	Verinag Publishers Mirpur.
(10)Sir Francis young Husband K.C.I.E	Kashmir	Verinag Publishers.
(11) Justice Mohammad Yousaf Saraf	Kashmiris Fight for Freedom	Feroz Sons Lahore ,1977
(12)Syed Mahmood Azad	تاریخ کشمیر	سیادت پبلیکشنز مظفر آباد 1990
(13) Syed Mir Ali Hamdani	ذخیرۃ الملوک	بک سنٹر راولپنڈی 1987
(14)۔ پنڈت کلہن (مصنف راج ترنگنی) مترجم ٹھاکر اچھر چند شاہپوریہ	کشمیر کا قدیم ترین جغرافیہ (مصنفہ ۱۱۲۵)	مطبوعہ ویری ناگ پبلشرز 1991
(15) IAN STEPHEN	HORNED MOON	CHATTO & WINDUS
(16) Kenin Brigid	Travells Through Kashmir.	Calcatta

سید سلیم گردیزی

سلیم صاحب نے اس کتاب میں کشمیر کی تاریخ وتہذیب کے قریب قریب سبھی نقوش سمیٹ لیے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں جس ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے وہ بہت کم محققین کو حاصل ہے۔ کشمیر کو پوری دنیا نے ''فردوس برروئے زمیں'' قرار دیا ہے مگر ہر دور میں، اور بطور خاص بیسویں صدی اور اوائل اکیسویں صدی میں اس فردوس پر جن دوزخوں کے در کھولے گئے ہیں وہ تاریخ کشمیر کے ہولناک اور عبرت ناک ابواب ہیں اور سلیم صاحب نے ہر صورت حالات کو کمال دیانت اور صداقت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ زبان پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے چنانچہ ان کی پوری تحریر دریا کی طرح رواں دواں ہے۔ میری رائے میں سلیم صاحب کا یہ کارنامہ ''کشمیریات'' میں ایک یادگار اور غیر فانی اضافہ ہے۔

احمد ندیم قاسمی